# دائرۃ المعارف

یعنی

معارف اعظم گڈھ

کی

چھتیسویں ۳۶ جلد

از

جولائی ۱۹۳۵ء تا دسمبر ۱۹۳۵ء

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

مطبع معارف دار المصنفین اعظم گڈھ

# فہرست مضمون نگارانِ معارف

## جلد ۳۶ جولائی ۱۹۳۵ء تا دسمبر ۱۹۳۵ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

# فہرست مضامین

## جلد ۳۶ جولائی ۱۹۳۵ء تا دسمبر ۱۹۳۵ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

| جلد ۳۶ | ماہ ربیع الاول ۱۳۵۳ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۳۵ء | عدد ۱ |
| --- | --- | --- |




## مضامین

# شذرات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہندوستان کے مشہور پرانے عالم و واعظ و خطیب مولنا شاہ سلیمان صاحب قادری چشتی پھلواروی نے جن کے نغمون نے ہمارے ملک کے پورے طول و عرض کو کم از کم نصف صدی تک پرشور رکھا تھا، وفات پائی، ۲۷ صفر ۱۳۵۴ھ کی تاریخ جمعہ کا دن اور صبح سات بجے کا وقت تھا کہ یہ طوطیِ خوشنوا ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا، پھلواری صوبہ بہار مین عظیم آباد پٹنہ سے ملحق ایک مردم خیز مشہور قصبہ ہے، جہان ڈیڑھ سو برس کے عرصہ میں بہت سے باکمال، اہل علم، علمار، صلحار، مشائخ اور شعرا پیدا ہوے، مرحوم بھی یہین کے رہنے والے، اور یہان کے بزرگون کے مستند و معتبر خانوادہ کے چشم و چراغ تھے، ۸۰ اسّی برس کی عمر پائی، غالباً ۱۲۷۶ھ مین پیدا ہوے،

مرحوم کی جوانی کے عہد مین تین باکمالون کے درس کی مسندین ہندوستان مین بچھی تھین، فرنگی محل لکھنؤ مین مولنا عبد الحی صاحب، سہارنپور مین مولنا احمد علی صاحب، اور دلی مین مولنا سید نذیر حسین صاحب کی، شاہ صاحب مرحوم نے فیض کے ان تینون سرچشمون سے فائدہ اٹھایا، پہلے فرنگی محل آئے، اور یہان سے فارغ ہوکر سہارنپور اور دہلی گئے، دلی کے قیام کا زمانہ جس کو ان کی تعلیم کا آخری عہد کہنا چاہئے ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۸۰ء ہے،

لکھنؤ کے قیام مین درسیات کے ختم کرنے کے بعد انھون نے طب پڑھی، اور اسی طبیب کی حیثیت سے انھون نے دنیا مین اپنی زندگی کا آغاز کیا، چنانچہ شروع مین حکیم محمد سلیمان کہلائے، اور اسی کا اثر تھا کہ شاعری مین



چسکا جسکا ان کو بچپن سے تھا، اور لکھنؤ کی صحبت مین جسکا چٹخارہ اور بڑھ گیا تھا، اپنا تخلص حاذق رکھا تھا، زیادہ تر اردو اور عربی مین اور کمتر فارسی مین شعر کہتے تھے، غزلین بھی کہتے تھے، اور لکھنؤ کے مشاعرون مین پڑھتے بھی تھے، صوبہ بہار کے مشہور عالم شاعر شوق نیموی اون کے ہمدرس و ہم صحبت و ہم استاد تھے، شاہ صاحب مرحوم کی زبان سے اُن کے اس عہد کے ایک دو شعر سنے تھے،

اس عہد کے نوجوان علمار نے جو زمانہ کے انقلاب سے متاثر اور قوم و ملت کی تبہ حالی کے درد سے بیتاب ہوکر روشِ زمانہ کے مطابق کچھ کام کرنا چاہتے تھے **ندوۃ العلمار** کے نام سے پہلے کانپور میں، اور پھر لکھنؤ مین ایک انجمن کی بنیاد ڈالی، مولنا سید محمد علی صاحب، مولنا شبلی صاحب، مولنا عبد الحق صاحب حقانی، مولنا سید ظہور الاسلام صاحب فتحپوری، مولنا ابراہیم صاحب آروی، مولنا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی وغیرہ اس جماعت کے ممتاز ارکان تھے، اسی انجمن کا پلیٹ فارم تھا جس مین شاہ صاحب مرحوم کی خطیبانہ قوتِ بیان و تسخیر قلوب کا شہرہ عام ہوا، ندوۃ العلمار کا کانپور سے لکھنؤ آنا اور وہان دار العلوم کی بنیاد پڑنا بھی شاہ صاحب ہی کی تحریک و تجویز کا نتیجہ ہے، ورنہ وہ کھنچکر کب کا دہلی پہنچا ہوتا،

ندوہ کی مجلسون سے مرحوم کی خوش بیانیون کی داستان اور ملک کی انجمنون اور مجلسون اور کانفرنسون میں عام ہوئی، سرسید مرحوم نے شاہ صاحب مرحوم کی وہ تقریر جو انھون نے ندوہ کے ایک جلسۂ سالانہ مین کی تھی اپنے اخبار مین "شاہ سلیمان کا نیچریانہ وعظ" کی سرخی سے چھاپی، سرسید کے بعد نواب محسن الملک مرحوم نے ان کو اپنی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس مین جو ان دنون تعلیم یافتہ مسلمانون کا واحد مجلسی مرکز تھا کھینچا، مرحوم کی خوش بیانی نے ان "نیچری مسلمانون" کو بھی مسحور کیا، رنگون وغیرہ مین نواب صاحب کے ساتھ شاہ صاحب بھی کانفرنس کے کامون مین شریک تھے، اور صاحبزادہ آفتاب احمد خان کے زمانہ تک شریک رہے،

مرحوم وسیع النظر عالم، بذلہ سنج ادیب، خوش بیان خطیب، پراثر واعظ، موقع شناس مقرر، اور بڑے بڑے بزرگوں کے حلقوں سے فیضیاب ہوئے تھے، انکو تاریخ کا شوق اور عربی نظم و نثر کا اچھا ذوق تھا، اچھے کتبخانوں، اور کتابوں کی تلاش رہتی تھی، اور اس حیثیت سے وہ اپنے ہمعصروں مین پورا امتیاز رکھتے تھے،

---

وہ مذہب کے لحاظ سے وسیع المشرب تھے، وہ سب کچھ تھے، اور سب کے ساتھ تھے،

با ما شراب خوردہ و بزاہد نماز کردہ،

تاہم دو باتوں مین وہ نہایت سخت تھے، ایک تو اعتزال کے خیالوں سے بہت برہم ہوتے تھے، اور دوسرے حضرت علی مرتضیٰ اور اہلبیت کرام رضی اللہ عنہم کی محبت و تعظیم مین بیحد غلو فرماتے تھے، اور اس راہ مین جب جوش مین آتے تھے، تو بڑوں بڑوں پر ہاتھ صاف کر دیتے تھے، اس قسم کے ان کے دوستانہ مناظروں کے کئی منظر مین نے اپنی طالب العلمی مین دیکھے ہین،

---

ان کا خاندان صوفیہ کا مجمع تھا، تصوف کے گودون مین پیدا ہوئے، پرورش پائی، اور پروان چڑھے، اور عمر بھر اسی رنگ مین رہے، اور یہی رنگ ان پر غالب تھا، قادری بھی تھے اور چشتی بھی تھے، جہان اپنے گھر سے فیض پایا تھا، حاجی شاہ امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی نسبت رکھتے تھے، پنجاب، مدراس، شمالی بہار اور صوبہائے متحدہ مین ان کے مریدون کی بڑی تعداد تھی،

---

ان کے وعظون مین عجب اثر تھا، کبھی رلاتے، اور کبھی ہنساتے تھے، ان کے سنجیدہ چٹکلے، اور ظریفانہ نکتے لوگون کو بیحد محظوظ کرتے تھے، ان کی آواز بہت بلند، سریلی اور مؤثر تھی، ان کا لحن نہایت دلپذیر تھا، مثنوی خاص انداز سے پڑھتے تھے کہ سننے والے جھوم جھوم جاتے تھے، ان کے وعظون سے ہر خیال اور ہر قماش کے لوگ یکسان دلچسپی رکھتے تھے، جاہل، عالم، مولوی، مشائخ، ڈاڑھی منڈے اور بزرگ ریش، نئے پرانے تعلیم یافتہ اور اہل علم سب لذت اندوز ہوتے تھے،

---

میرے ساتھ مرحوم کے گوناگون تعلقات تھے، مجھے اپنے عزیز سے کم نہین سمجھتے تھے، میرے والد مرحوم انکے ہم پیر اور ان کے خسر کے مسترشد تھے، میرے بھائی مرحوم طب مین اُن کے شاگرد تھے، مین نے بچپن مین پھلواری کے قیام کے زمانہ مین ان سے ابتدائی منطق کے دو چار سبق پڑھے تھے، وہ جب ۱۹۰۲ء مین ندوہ کے معتمد تعلیمات منتخب ہوئے تھے، اور مستقل قیام ندوہ مین اختیار فرمایا تھا، تو ان کی بزرگانہ عنایات اور حوصلہ افزائیون نے میری علمی ترقیون مین مدد دی، یاد ہے کہ اسی زمانہ مین نواب محسن الملک مرحوم دارالعلوم ندوہ کے معائنہ کے لئے تشریف لائے تھے، شاہ صاحب نے مجھے اور میرے ہم درس مولانا ظہور احمد صاحب وحشی شاہجہان پوری کو امتحاناً پیش فرمایا تھا، مین نے نواب صاحب کے خیر مقدم مین عربی مین ایک قصیدہ لکھا تھا، شاہ صاحب نے یہ کہکر مجھے پیش کیا کہ یہ میرے عزیز ہین، اور آپ کو اپنا قصیدہ سنائین گے، نواب صاحب نے مزاحاً فرمایا کہ یہ جب آپکے عزیز ہین تو مین اُن کا امتحان نہین لونگا کہ امتحان سے پہلے ہی ان پر ایمان لا چکا، شاہ صاحب نے فرمایا یہ میرے ہمنام بھی ہین، نواب صاحب نے فرمایا تو اور بھی یہ امتحان سے بالاتر ہین،

---

مین نے اپنا قصیدہ پڑھا جو افسوس ہے کہ اب موجود نہین، تو نواب صاحب نے فرمایا کہ مین تو اس پرانی ادب دانی کا قائل نہین، عربی کا کوئی اخبار منگوایئے اسکو یہ پڑھیں تو البتہ، اس زمانہ مین اللواء اور المؤید عربی کے مشہور اخبار تھے، وہ منگوائے گئے، اور مین نے ان کو پڑھا اور صحیح ترجمہ کیا تو بیحد خوش ہوئے، شاہ صاحب بھی بیحد محظوظ ہوئے، اور اس زمانہ کے اخبارات، وکیل، وطن اور کرزن گزٹ مین نواب صاحب کے اس معائنہ کی جو کیفیت چھپوائی اس مین میرا ذکر خاص طور سے فرمایا، یہ اخبارات مین میرا پہلا ذکر تھا، انکی اس تحریر میں ایک فقرہ بھی تھا کہ "ملک و ملت کی خدمت کیلئے انشاء اللہ صوبہ بہار ہر دور مین ایک سلیمان پیش کرتا رہیگا،" رحمہ اللہ،

بات مین بات یاد آتی ہے، ندوہ کے ایک جلسہ میں جو لکھنؤ مین غالباً ۱۹۱۵ء مین تھا، چار سلیمان جمع ہو گئے تھے، قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری مصنف رحمۃ للعٰلمین، مولنا سلیمان اشرف صاحب بہاری (استاذ دینیات مسلم یونیورسٹی) مولنا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی، اور خاکسار سلیمان، شاہ صاحب نے فرمایا کہ آجکل گلی گلی سلیمان پیدا ہو گئے ہین لیکن ان مین سلیمان بن داؤد مین ہون، ع پریان نئی نئی ہیں سلیمان نئے نئے (شاہ صاحب کے والد ماجد مرحوم کا نام داؤد تھا، اور اسی لئے ان کی مہر میں وَوَرِثَ سُلَیْمَانُ دَاوٗدَ، کندہ تھا،) مجمع بے اختیار ہنس پڑا،

—— ·○<⁘>○· ——

پھر فرمایا "پہلے سلیمان فرد تھا، اور اب رباعی ہے، چار چار سلیمان یکجا ہیں"۔ افسوس کہ یہ رباعی قاضی سلیمان کی وفات سے چند سال گذرے کہ مثلث بن چکی تھی، اور اب ۲۰ صفر کو قطعہ ہو گئی، اب اس رباعی کے صرف دو مصرع باقی ہیں، خدا جانے یہ بھی کب اس صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائیں، واللہ ھو الباقی

—— ·○<⁘>○· ——

شاہ صاحب کے چٹکلے اور تقریری دلآویز نکتے اس قدر ہیں کہ ان کو کوئی جمع کرے تو رسالہ بنجائے، رنگون مین محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ تھا، مولویوں نے کانفرنس والون پر کفر کا فتویٰ لگایا تھا، شاہ صاحب بھی نواب محسن الملک مرحوم کیساتھ اس جلسہ مین گئے تھے، تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو فرمایا، یہاں کے مولویوں نے اہل کانفرنس پر کفر کا فتویٰ لگایا ہے، جس مین شاید مین بھی داخل ہون، مگر غور تو کیجئے کہ نواب محسن الملک تو مہدی ہیں، (نام مہدی علی تھا) ان کو کون مسلمان دجال کہیگا، اور مجھ پر تو کفر کا فتویٰ لگ ہی نہیں سکتا کہ خود اللہ تعالیٰ کی شہادت ہے وَمَا کَفَرَ سُلَیْمَانُ وَلٰکِنَّ الشَّیٰطِیْنَ قَدْ کَفَرُوْا (سلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا، بلکہ شیطانوں نے کفر کیا) مجمع ان نکتون سے بیحد محظوظ ہوا، اور مولویوں کی فتویٰ گری کا بادل شاہ صاحب کے ان دو چٹکلوں سے ہوا ہو گیا،

ف یہ دو سنین ہیں، فرد ایک یعنی شعر فرد، اور دوسرا یعنی اکیلا،



پورے پچاس برس تک ہندوستان کا گوشہ گوشہ ان کے پر کیف و پر اثر خطبوں سے معمور رہا، جس جلسہ میں وہ ہوتے تھے، ان کے سوا ہر آواز ماند پڑ جاتی تھی، جلسہ کے اہم موقعوں پر انکی طوطی گفتاری بڑی بڑی پیچیدگیوں کو حل کر دیتی تھی، شاید ۱۹۰۸ء میں ندوہ کا عظیم الشان اجلاس پٹنہ میں تھا، شرکا میں ملک کے مشہور و ممتاز ارباب عمائم ایک طرف اور اس عہد کے مشہور تعلیم یافتگان جدید آنریبل جسٹس شرف الدین سید علی امام، سید حسن امام، نصیر حسین بیرسٹر، شیخ (سر) عبد القادر وغیرہ دوسری طرف شریک جلسہ تھے، یہ پہلا موقع تھا جبمین دستار بند اور ہیٹ پوش ایک جگہ مل کر بیٹھے تھے، اور ملک و ملت کے درد کا درمان سوچ رہے تھے، حسن امام صاحب کی تقریر کے ایک بے محل فقرہ پر علماء میں برہمی پیدا ہوئی، شاہ صاحب فوراً کھڑے ہو گئے، اور ایسی تقریر کی کہ سب دُھل گیا، فرمایا آج پہلا موقع ہے کہ نئے اور پرانے مل رہے ہیں، ایک دوسرے سے شکوے ہو رہے ہین، بدگمانیان دور ہو رہی ہیں، پھر ایک دو فقروں کے بعد حافظ کا یہ شعر اس مزہ سے پڑھا کہ فریقین مسکرا کر رہ گئے،

شکر للہ الحمد میان من و او صلح فتاد | حوریان رقص کنان نعرۂ مستانہ زدند

—— ·○<○>○· ——

ندوہ کے اسی اجلاس مین نصیر حسین صاحب بیرسٹر پٹنہ نے جو اب صوفی صافی ہو چکے ہیں، ایک نہایت پر جوش و پر اثر تقریر کی تھی، اثر یہ تھا کہ صدر سے لیکر پائین تک جو تھا رو رہا تھا، بڑے بڑے عمامہ والون اور ہیٹ پوشون کو میں نے خود دیکھا (میری عمر اس وقت ۱۵-۱۶ برس کی ہوگی) کہ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے، شاہ صاحب کی موقع شناسی ملاحظہ ہو، اسی عالم میں کہ لوہا گرم تھا، چندہ کی تحریک شروع کر دی، نصیر حسین صاحب نے اپنا کوٹ اور ویسٹ کوٹ اور جو کچھ ان جیبوں میں تھا مع گھڑی کے ندوہ کی نذر کر دیا، اسی حالت مین شاہ صاحب نے برمحل ایک شعر اپنی مخصوص لے میں ایسا پڑھا کہ سارے مجمع پر جادو کر گیا مجھے صرف ایک مصرع یاد ہے،

وقت آن آمد کہ من عریاں شوم

یہ عالم ہوگیا کہ ہر طرف سے روپیے، کپڑے، گھڑیاں اور زیورات برسنے لگے، علمار نے جبّے اور دستاریں اتار اتار کر نذر کردیں، یاد آیا ایک بزرگ جنمیں حضرت شاہ امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے خلیفہ تھے، ان کے سر پر پیر کی دستار تھی، جوش میں آکر وہ بھی انھوں نے اتار ڈالی، وہ دستار جلسہ میں نیلام ہوئی، اور جناب مولنا حبیب الرحمان خاں شروانی جیسے قدر شناس کی قسمت میں آئی،

بات کہاں سے کہاں جانکلی،

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

معلوم نہیں عہد ماضی کی یہ کہانیاں، حال کے ناظرین کو بھی "لذیذ" معلوم ہوں یا نہ ہوں، اس لئے اپنے مزہ کے لئے ان کو بے مزہ کرنا مناسب نہیں،

شاہ صاحب کی ذات ایک عجیب جامع ہستی تھی، ایسے لوگ اب پیدا نہ ہونگے، زمانہ بدل رہا ہے، ہوا کا رخ ادھر ہی ہو، وہ قدیم و جدید کے درمیان حلقۂ اتصال تھے، اب قدیم بھی جدید ہورہا ہے، اور جدید جدید ترین بن رہا ہے، دعا ہے کہ اُن کے اخلاف، برادرم شاہ حسین میاں صاحب اور ان کے بھائی اپنے بزرگ باپ کے سچے جانشین ثابت ہوں،

لکھنؤ سے سچ کے نام سے ہمارے دوست مولنا عبد الماجد صاحب دریا بادی ایک ہفتہ وار مذہبی اخبار نکالا کرتے تھے، جو اپنے خاص رنگ میں ہر طرح ممتاز تھا، ایک سال ہوا کہ قرآن پاک کے انگریزی ترجمہ کی مشغولیت کے سبب اس کو بند کر دیا تھا، اب چند ہفتوں سے انھوں نے صدق کے نام سے دوسرا



اخبار نکالا ہے، جو روح و قالب اور صورت و سیرت دونوں کے لحاظ سے پہلے اخبار کا مرادف ہے، ضرورت ہے کہ اہل ذوق اسکی پوری قدر کریں، اور ان کے رشحات قلم سے سیراب ہوں قیمت تین روپئے سالانہ ہے، اور پتہ منیجر اخبار صدق لکھنؤ ہے،

بدر الدین چینی صاحب جو چین سے ہندوستان تحصیل علم کے لئے آئے تھے، اور جامعہ میں انگریزی اور ندوہ میں عربی حاصل کی، اور یہاں سے فارغ ہوکر وہ عربی زبان کی تکمیل کے لئے گذشتہ رمضان میں مصر کے جامع ازہر میں گئے تھے، اپنے ایک مکتوب میں مصر کی تعلیمی و مذہبی حالت کے متعلق اپنے حسب ذیل تاثرات لکھتے ہیں:

"مصر گو علوم عربی و اسلامی کا مرکز ہے، مگر نوجوانوں کے دلوں میں حرارت اسلام بہت کم ہو، یہاں کی زندگی یورپ کی زندگی سے کسی طرح کم نہیں، جو کچھ مظاہرے ہیں وہ یورپی ہی یورپی نظر آتے ہیں، اور جن لوگوں میں تفرنج (یورپ مآبی) کا رجحان کم ہے وہ اس امید میں بیٹھے ہیں کہ جاپان فوراً اسلام کے حلقہ میں داخل ہوجائے، تاکہ ان کی کشتی میں بیٹھکر امن و سلامتی کے ساحل پر پہنچا جائے، اور ممالک اسلام کے تمام امور ان کی حفاظت میں چھوڑ دیئے جائیں، اور خود امن اور چین کی زندگی بسر کریں۔"

جب میں ۱۹۲۳ء میں مصر گیا تھا، تو وہاں کے سابق شیخ الازہر علامہ ابوالفضل نے مجھ سے پوچھا تھا کہ ہندوستان کے علماء کے گذر اوقات کی کیا صورت ہے،؟ المنار کے اڈیٹر شیخ رشید رضا جو میرے ساتھ تھے، اور ہندوستان آچکے تھے، سبقت کرکے بولے کہ ہندوستان کے علمار بڑے قناعت پسند ہیں، چند روپیوں کی تنخواہ میں گذر کرلیتے ہیں، میں نے گذارش کی کہ مصر دیکھنے سے پہلے تو میں ہندوستانی علمار کو بدقسمت سمجھتا تھا کہ وہ کسی اسلامی سلطنت کی سرپرستی سے محروم ہیں اور اسلئے کس مپرسی میں ہیں، لیکن مصر کو دیکھکر معلوم ہوا کہ خدا کی

مصلحت اسی میں تھی، مصر کے علماء جو سلطنت اور محکمۂ اوقاف سے شاہانہ تنخواہیں پاتے ہیں، چین کی نیند سوتے ہیں، اور امیرانہ ٹھاٹھ رکھتے ہیں، (اسوقت ہم لوگ شیخ کے ہاں مدعو تھے، میز و کرسی پر کھانا تھا، اور طلائی و نقرئی برتن اور چھری کانٹے میز کی زینت تھے)

---

مصر کی دولت مصر کی افیون ہے، اور اس افیون میں علماء، اور تعلیم یافتہ سب مدہوش ہیں، جاگیریں ہیں، جائدادیں ہیں، بیش قرار تنخواہیں ہیں، اس حالت میں دین و ملت کا خیال کس کو آئے اور کیونکر آئے، خدا سید جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ، اور سید رشید رضا کو جزائے خیر دے جن کے بدولت وہاں امید کا چراغ روشن ہے، ورنہ ازہر اور ازہری تو اپنا اثر کھو چکے، قدیم وہاں سے جا چکا، اور جدید وہاں آیا نہیں،

---

عباسی عہد کا ایک مشہور عربی شاعر بشار بن برد ہے، اس کا دیوان اب تک چھپا نہ تھا، اس کے دیوان کا ایک نہایت عمدہ اور قدیم نسخہ کتبخانۂ آصفیہ حیدرآباد دکن میں تھا، مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے ایک معلم عربی مولانا بدر الدین صاحب علوی نے جو عربی زبان کے ممتاز ادیب بھی ہیں، بڑی محنت سے اس نسخہ کی تصحیح و مقابلہ اور تحشیہ کیا ہے، اور مصر کی مجلس ترجمہ و تالیف نے اسکو اپنی طرف سے چھاپا ہے، موصوف اب ابن درید کا کلام جمع کر رہے ہیں، موصوف گو بوڑھے ہو چکے ہیں، مگر اپنی ہمت سے جوانوں کو شرماتے ہیں،

---

تاریخ ہند کے سلسلہ میں جسکا کام شروع کر دیا گیا ہے، شیخ عبد العزیز صاحب، دھولیا صوبہ خاندیس سے مطلع کرتے ہیں،

"اس شہر دھولیا میں ہندوؤں نے "راجوڑے سونشودھن مندھر" قائم کیا ہے جس کی غرض و غایت یہ ہے کہ مہاراشٹر کے تاریخی معلومات بہم پہنچائے جائیں، اس غرض سے انھوں نے بہت سی قلمی کتابیں، اور راجاؤں کے فرمان جمع کئے ہیں، اس سلسلہ میں انھوں نے مغل بادشاہوں اور بیجاپور کے سلاطین کے قریب قریب ایک ہزار فرامین فارسی کے اور پندرہ بیس قلمی تاریخی کتابیں مہیا کی ہیں، راجوڑے نامی ایک شخص پونہ کا باشندہ تھا، اس نے مہاراشٹر کے تاریخی معلومات بہم پہنچانے کے لئے بیس پچیس سال کی کد و کاوش سے بہت کچھ قلمی کتابیں اور فرمان جمع کئے تھے، وہ دھولیا میں اسی غرض سے آیا تھا، اور یہاں اتفاقاً مر گیا، اسی کی یادگار میں ہندوؤں نے "راجوڑے سونشودھن مندھر" قائم کیا ہے،

---

مردوں کی یادگار تو الگ رہی، ہمارے مسلمان زندوں کی پکار بھی سنتے ہیں؟ تاریخ ہند کا چرچا کچھ دنوں ہم لوگوں میں رہا، اور اگر اس کو یونہی چھوڑ دیا جائے تو ہماری قوم کی دوسری ہزاروں مفید تحریکات کے مدفن میں یہ بھی دفن ہو جائے، مگر عزم یہ ہے کہ انشاء اللہ دار المصنفین کے اندر یہ کام انجام پا کر رہے گا،



---

یورپ میں دستور ہے کہ اکابر اہل علم کے علمی خدمات کی قدر شناسی میں ان کے نام پر اُن کے مذاق کے علمی تحقیقی مقالات کا مجموعہ جو مختلف اہل قلم کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں، نذر کیا جاتا ہے، اسی کی تقلید میں اکثر پنجاب کے اور بعض ہندوستان کے اہل علم یہ چاہتے ہیں کہ اردو کے مشہور محقق حافظ محمود خان صاحب شیرانی پروفیسر اردو پنجاب یونیورسٹی کے خدمات کے اعتراف میں اردو و فارسی ادبیات کے مختلف عنوانات پر اہل علم کے مقالات کا ایک قابل قدر مجموعہ شائع کریں، امید ہے کہ اکتوبر تک اس کی ترتیب عمل میں آئے،

---

# مقالات

## جدید کلام
## قدیم زبان میں

از مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی استاذ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن

تقریباً دو سال ہوتے ہیں کہ گیا (بہار) کے اردو ماہنامہ "ندیم" کے سالانہ نمبر میں خاکسار نے صوبہ بہار کی اردو نثر کی پہلی کتاب کے عنوان سے مولانا محمد احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مخطوطہ کا ذکر بطور استفسار کے کیا تھا، چند دنوں کی خاموشی کے بعد کچھ روز ہوتے ہیں، کہ پٹنہ کے ایک رسالہ میں ایک مخطوطہ کا ذکر کیا گیا، جس کے متعلق صاحب مضمون کا بیان ہے کہ میری پیش کردہ کتاب سے اس کتاب کی تصنیف کا زمانہ مقدم ہے، غالباً اس مخطوطہ کے مصنف مولانا شاہ ظہور اللہ نامی پھلواروی رح ہیں، اور شاید اس میں دینیات کے مسائل "زاد نجات" یا "مفتاح الجنۃ" وغیرہ کے نہج پر لکھے گئے ہیں، وہ مضمون اسوقت میرے سامنے موجود نہیں ہے، اور صحیح طور پر یہ یاد بھی نہیں رہا کہ اس کتاب میں اور کیا کیا مضامین ہیں، بہر حال تقریباً دو سال کی مدت میں ارباب خبر و واقفیت کا "صوبہ بہار" کے تصنیفی ذخیروں سے صرف ایک ہی مخطوطہ کا پیش کرنا کم از کم میرے لئے اس اطمینان کو ضرور پیدا کرتا ہے، کہ مولانا محمد احسن گیلانی مرحوم کی کتاب کا نمبر صوبہ کی لسانی تاریخ (حصہ نثر) میں اگر اول نہیں تو دوم ضرور ہے، اور تاریخی اہمیت کے لئے یہ فرضیت بھی ناقابل التفات نہیں قرار پا سکتی،



میری حیثیت اپنے اس مضمون میں صرف سائل اور مستفسر کی تھی، لیکن اس مضمون کے بعد اب اگر اپنے استفسار کو دعوی کی شکل میں بدل دوں، اور گیلانی کی اس کتاب کو نثر بہار کی دوسری کتاب قرار دوں، تو غالباً مجھکو اس کی اجازت مل سکتی ہے، اگرچہ اب بھی "عدم العلم، علم العدم" کو مستلزم نہیں ہے لیکن استقرائی نتائج کی بنیاد جن مقدمات پر قائم کی جاتی ہے، عام طور پر اس کا یہی حال ہوتا ہے، واللہ اعلم بالصواب،

ندیم چونکہ صرف ادب اردو کا پرچہ ہے، اس لئے اس میں اس کتاب کے متعلق میرے مضمون کا صرف وہ حصہ شائع ہو سکا، جس کا تعلق صرف صوبہ کی لسانی تاریخ سے تھا، لیکن مضمون کا وہ قطعہ جسمیں تیقر نے بہار کے اس قدیم مخطوطہ کے چند اہم مسائل اور حقائق پر اجمالی تبصرہ کیا تھا، وہ اب تک غیر مطبوعہ پڑا ہوا تھا، بلکہ طاق نسیاں کی نذر ہو چکا تھا، میرے دوست مولینا سید احمد حیدر آبادی سلمہ اللہ کو خدا جانے اس مسودہ میں کیا نظر آیا کہ ان فرسودہ اوراق کو ادھر ادھر سے جمع کر کے خوشخط اور صاف حرفوں میں نقل کر کے میرے سامنے لائے، ان کا اصرار ہے، کسی علمی رسالہ میں اسے شائع کر دیا جائے، ہندوستان میں "علمی" مجلہ کے لفظ کے ساتھ ذہن کی دفعی حرکت اعظم گڈھ کے مجلہ علیہ معارف غرا کی طرف ہو جاتی ہے، اور یہی ہوا، فقیر یں مضمون بھیج دیتا ہوں، کارکنان معارف پسند فرمائیں، تو اوسے شائع کر دیں، ممکن ہے کہ ارباب بصیرت اس کے بعد اردو زبان کے اس صد سالہ مسودہ کو بہار ہی کی اردو کی نہیں، بلکہ ہندوستان کی اردو کی شاید ایک اچھی یادگار قرار دیں،"

المعذور بالامانی

مناظر احسن گیلانی عفی اللہ عنہ،

مذکور الصدر کتاب اگرچہ غدر سے پہلے اس وقت تصنیف ہوئی ہے، جب مغربی اثر و اقتدار شمالی ہند میں خصوصیت کے ساتھ بنگال و بہار پر تسلط حاصل کر چکا تھا، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے، کہ ملک میں اس

وقت تک بزبان اکبر مرحوم صرف توپ (یعنی بسولا) پہنچا تھا، اور پروفیسر (یعنی رندن) کی نوبت ابھی نہیں آئی تھی، یا بہت کم آئی تھی، اس لئے غیر حساس فطرتون پر خصوصاً مسلمانون پر زیادہ تر یورپ کے حیلی آلات کیمیائی اشتعال انگیز مواد ہی کا عموماً رعب قائم تھا، اسی لئے ملک کے دردمندون کو جو کچھ بھی قلق تھا یا ہونا چاہیے تھا، وہ اپنی جانی مالی پریشانیون کا تھا، اتنی نزاکت کن دماغون میں تھی کہ بے تمیزی کے اس طوفان کا بھی اندازہ کرلیتے، جو اس مغربی آندھی کے پیچھے دبے پاؤن آرہا تھا، کون جانتا تھا کہ آج جس زدکو زر وزمین تک محدود سمجھا جاتا ہے، آیندہ چل کر یہی ناموس وایمان پر کاری ضرب کی شکل اختیار کرے گی،

حیرت ہوتی ہے، کہ مؤلف کتاب باوجودیکہ اس وقت کی سرکار برطانیہ کے ایک معزز عہدہ دار یعنی داروغہ شجاعت علی مرحوم کے صاحبزادے تھے، جن کے متعلق کہاجاتا ہے کہ چند تھانون کے سرکل انسپکٹر تھے، اور گھر کی ساری فراغبالیان انھی کی بدولت تھیں تاہم انگریزی پولیس کے افسر کے گھر میں خدانے اس بچہ کو پیداکیا جس کے نازک شعور کی رگ ریشوں میں اس آنے والے طوفانی اتھل کی تصویرین چھپ رہی تھیں، جو آخر ایک سوسال کے بعد ہندوستان کے طول وعرض میں اسکولون، اور کالجون، رسالون اور اخبارون کے دامنون سے ابل ابل کر یہ دھمکی دیرہے ہیں، کہ ہندوستان میں رحمۃ للعالمین، خاتم الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی امت مرحومہ وفاداری کے عہد پر زیادہ دن تک قائم نہیں رہ سکتی، اگر نام کے اعتبار سے نہیں تو کام کے لحاظ سے (لافعلہ اللہ) اسماً نہیں تو اعتقاداً وعملاً مسلمان، مسلمان باقی نہ رہینگے، بہرحال آج محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام اور ان کے قائم کردہ آئین ونظام کے متعلق وساوس

ا؎ لسان العصر مرحوم کے مشہور شعر کی طرف اشارہ ہے، جس میں موجودہ نظام تعلیم پر ان مختصر لفظوں میں تنقید کیگئی ہے،

توپ کھسکی پروفیسر پہونچے،
جب بسولا ہٹا تو رندہ ہے،



واوہام کی جوزہریلی گیسیں اور سیاہ بخارات فلسفہ، تاریخ، جغرافیہ، سائنس، وغیرہ وغیرہ علوم کے پرفریب انتساب کیساتھ دجل اور حق پوشی کی انتہائی کوششوں کے پردون میں پھیلائے جارہے ہیں، یقین کیجئے کہ مولانا موصوف نوراللہ مرقدہ، کی وقاد فطرۃ نے اس کا اندازہ آج سے سوبرس پیشتر کرلیا تھا، اور غایت بالغ نظری اور دور نگاہی، متانت وسنجیدگی کیساتھ انھی کے تشفی بخش جوابون کو اس کتاب میں درج فرمایا ہے،

کتاب تو ۱۲۶۶ھ میں اپنی طالب علمی کے وسطانی عہد میں لکھی گئی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ اس عظیم خطرہ کا احساس ان کو اس سے بہت پہلے اپنے اس کوردہ گاؤن گیلانی میں ہوچکا تھا، کیونکہ ان کی سوانح حیات سے معلوم ہوتا ہے، کہ طلب علم کی راہ انھون نے ماں باپ کے جبر واکراہ سے نہیں، بلکہ بالغ وجوان حتی کہ متاہل ہونے کے بعد سوچ سمجھ کر اختیار کی تھی، اور بڑی وارفتگی وسرمستی کیساتھ اختیار کی تھی، خود اپنی ایک دوسری کتاب حل العقود کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں،:-

| | |
|---|---|
| وفقنی اللہ فی اول الریعان فرط | آغاز شباب ہی میں حق تعالی نے مجھے اس کی |
| الشغف لاخذ العلم من افاضل | توفیق انتہائی ذوق وشوق کے رنگ میں |
| الاعیان، | عطا فرمائی، کہ ملک کے جلیل القدر فضلاء |
| | وعلماء سے تحصیل علم کرون، |

پھر گھربار، بیوی، بچے، وطن کے چھوڑنے کا ذکر ان لفظوں میں کرتے ہیں،:-

| | |
|---|---|
| ولم یتیسر لی ذلک الا بمفارقۃ الاوطان | لیکن اس کا موقع بغیر اس کے مجھے میسر نہ |

ا؎ آج یہ سن کر کون باور کرے گا، کہ مولانا شادی بیاہ بلکہ فرزند کے تولد ہونے کے بعد اسلامی علوم کے سیکھنے کے لئے گھر سے باہر نکلے، علم کے شوق، دینی خدمت کے ذوق میں کچھ اس طرح منہمک ہوئے کہ پورے چودہ سال بعد گھر اس وقت واپس آئے، کہ آپ کے فرزند اکبر جوان ہوچکے تھے، آج دوسرون کی علمی قربانیون پر ہمیں جھڑکیاں مل رہی تھیں، لیکن کل جب علمی ذوق غیرون میں نہیں بلکہ اپنے اندر تھا تو کیا گاؤن گاؤن میں ان قربانیون کی کمی تھی، ۱۲

وترك العشائر والخلان، فاخترت السفر على الحضر وأوقعت نفسي في البلايا والخطر

اسکتا تھا کہ وطن و یاران وطن سے جدا ہو جاؤن اور اس لئے میں نے گھر کو چھوڑ کر سفر اختیار کیا اور اپنی جان کو ہر قسم کے مصائب و خطرات میں

اپنے علمی سفر کی داستان دہراتے ہوئے فرماتے ہیں،

ثم الجأني تحصيل شطر من العلوم الدينية والمعارف اليقينية الى ان القطني من بلد الى بلد وهد الى وهد

دینی علوم کی تحصیل اور یقینی معارف کی تلاش نے بالآخر مجھے اس پر مجبور کیا کہ ایک شہر سے دوسرے شہر ایک جگہ سے دوسری جگہ مارا پھرتا تھا،

پھر یہ سارا سفر کس لئے ہو رہا تھا، اس کا اندازہ ان کی مختلف تحریروں اور یادداشتوں سے ہوتا ہے،

بنارس میں انھون نے یہ کام کیا لکھنؤ پہنچے، اس وقت لکھنؤ لاٹ صاحب کا لکھنؤ نہیں، واجد علی شاہ مرحوم کا لکھنؤ تھا، لیکن واجد علی کی زمین بھی ان کے لئے چند دنون کے بعد آسمان بنکر رنجدہ ثابت ہو چکی تھی، فلسفۂ الٰہیات کی ایک قلمی کتاب کی تصحیح سے فراغت پانیکے بعد اس کے آخر میں لکھتے ہیں،

وقع الفراغ من تصحيح الكتاب في بلدة لكهنؤ في سنة ۱۲۷۲ شهر ذيقعدة حين تسلطت النصارى خذلهم الله على هذه البلدة وذهب السلطان واجد علي شاه للاستغاثة الى كلكتة.

کتاب کی تصحیح سے لکھنؤ میں ۱۲۷۲ھ میں فراغت پائی آئی، اور ذی قعدہ کا مہینہ تھا، یہ وہ زمانہ ہے، کہ نصاریٰ خدا انھیں رسوا کرے، شہر پر قبضہ کر چکے ہیں، اور سلطان واجد علی شاہ استغاثہ کے لئے کلکتہ روانہ ہوئے ہین،

اسلام کی ایک عقلِ عادل، روحِ صافی، قلبِ ذکی کی اس کشمکش کو دیکھئے کہ اس کے بعد ایک طرف اگر واجد علی شاہ کیلئے دعا بھی کرتے ہیں، لیکن مع ان کمزوریوں کا احساس بھی ہوتا ہے جن کے بعد قدرت



کے عدل و قسط کی میزان اپنے آخری نتیجہ کا اعلان ہمیشہ انقلاب حکومت کی شکل میں کرتی رہی ہے، یادداشت کے آخر میں لکھتے ہیں،

اللهم انصره واهده الى الصراط المستقيم،

اے اللہ تو اون کی مدد فرما، اور انھیں سیدھی راہ پر چلا،

کیا خلف کے لئے سلف کے اس طرز عمل میں کوئی اچھا اسوہ نہیں ہے، مولانا مرحوم باوجود یکہ سُنّی تھے، لیکن ایک شیعی بادشاہ جس سے بجز اسلامی تعلق کے آپ کو کوئی تعلق نہیں تھا، اور قیصر باغ کے قیصر کی جان جو اس کے جھوٹے خوشامدیون کی زبانوں میں عالم کی جان تھی جب مٹی کے برج میں دفن ہونے کیلئے لکھنؤ سے روانہ ہو چکی تھی، تو آیندہ بھی اس سے کیا توقع قائم کی جا سکتی تھی، لیکن اخوت کی ٹیس فروعی اختلافات کی کسک پر غالب آئی، اور اُسے آنا بھی چاہئے، ومثل هذا فليعمل العاملون،

حکومت کے اس انقلاب نے جو چیخ آپ کے سینہ میں پیدا کی "حل العقود" کے دیباچہ میں اسکی آواز بازگشت ان لفظوں میں گونجی ہے، فرماتے ہیں،

تسلط النصارى على تلك البلدان فوا اسفاه على الداهية الكبرى العظمى،

ان علاقون پر نصاریٰ کا قبضہ ہو چکا ہے، حسرت اور واویلا ہے، اس بڑی اور سخت ترین مصیبت پر،

لیکن کیا یہ رونا صرف مچھلی بھون اور چتر منزل کیلئے تھا، اودھ کی مٹی، اور گومتی کے پانی کے لئے تھا، ان ہی کے الفاظ میں سنو، روتے ہیں، اور کتنے دردناک لہجوں میں روتے ہیں،

عفوا اطلال العلوم ومعالمها ومحوا آثارها ورسومها حتى كادت شموس العلم الى الافول واختار للاهرون

ان نصرانیوں اور فرنگیون نے علوم کے سارے نشانات اور اسکی سب یادگارون کو مٹا دیا، علم کے آفتاب غروب ہونے لگے ہیں، اور ماہرین

زِ فرطِ الخمول — گمنامی کے گوشوں میں اپنے کو چھپا رہے ہیں

مولینا مرحوم کے نفس کا جو شعوری نقطہ تھا، اور جس کے ارد گرد ان کی ساری علمی سرگرمیوں کے دائرے گردش کر رہے تھے، ان ہی چند جملوں سے اس کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے، اور جس کا شعور اس درجہ بیدار اور دماغ جوکنّا ہو سمجھا جا سکتا ہے کہ یورپ جہان سے ابھی عوام کے کانوں میں صرف توپ کی آواز آ رہی تھی وہاں اسکی روح ان پُر فریب نغموں کی باطنی لہروں سے اگر متاثر ہو رہی ہو جس کی آوازیں آج ہندوستان کے گھاس اور پھوس کے چھپروں سے آ رہی ہیں، تو اس پر کیا تعجب ہے،

خصوصًا اس زمانہ میں اگرچہ کالج اور اسکولوں، اخبار و رسائل، ناول اور افسانے، ڈرامے، اور تماشوں کی شکل میں تو نہیں، لیکن لمبی لمبی داڑھیوں، نیچی نیچی عباؤں والے، ہیٹ پوش پادریوں کی ایک خاصی تعداد بجائے رانچی کے جنگلوں اور دکن کے بیابانوں کے ہندوستان کے مختلف شہروں میں بائبل کے ترجمے، اور مناظروں کی کتابیں بغلوں میں دبائے مصنوعی خوش خلقیوں، ریائی نرم زبانیوں کے ساتھ سڑکوں اور گلیوں میں عام طور پر پھر رہی تھی، یہ بھلے مانس پادری اپنے اخلاق کی بلندی کا ثبوت اپنے وطن یورپ میں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کی کلیسائی خانہ جنگیوں کی شکل میں پیش کر چکے تھے، جس کی نظیر[1] دنیا میں کوئی دوسری موجود نہیں، اور جس کے متعلق کہا جاتا ہے، کہ دس لاکھ آدمی مختلف شکلوں میں موت کے گھاٹ اوتارے گئے، مذہب جس کے نام سے، اور محض نام سے حرب و قتال اور دار و رسن کا

[1] میں نے نظیر کا لفظ قصداً لکھا ہے، کہ دراصل اس کلیسائی جنگ یا جبر و استبداد کی نظیر دنیا کے کسی مذہب میں نہیں پائی جاتی، اور اگر کسی مذہب میں پائی جاتی بھی ہو، تو کم از کم اسلام کی سیزدہ صد سالہ روشن تاریخ بحمد اللہ اس سے قطعًا پاک ہے، گو یورپ اب اس فکر میں ضرور ہے، کہ کسی طرح اسلام میں بھی اس نقشہ کو قائم کر دے، جس کا تماشہ عیسائی مذہب اور یورپ نے صدیوں دیکھا ہے، لیکن یابی اللہ الا ان یتم نورہٖ قرآن کا محافظ انشاء اللہ ایسا نہ ہونے دے گا،



یہ ہنگامہ برپا کیا گیا تھا، یورپ کے انتہا پسند طبائع نے اسی کی ضرورت کا شدت سے انکار کرنا شروع کر دیا، اور یوں وہاں ایک مستقل خیال ریشنلزم کے نام سے قائم ہو گیا، یہ فرقہ باطنی طور پر محض ملحد اور بے دین تھا، اسکی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اگر مذہب خون کے اسی سمندر، اور انسانی ہڈیوں کے اسی پہاڑ کا نام ہے، تو آخر ایسے مذہب کی انسان کو کیا ضرورت ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ جا و بیجا انھوں نے اپنے ملک کے عام مذہب یعنی عیسائیت پر اعتراضات و شکوک اور شبہات و وساوس کا ایک سلسلہ شروع کر دیا،

بہرحال یورپ میں اعتراضات کے یہ تیر عیسائی مذہب اور اس کے عقائد و مسائل پر الحاد و شکوک کی کمانوں سے نکل نکل کر مسلسل برس رہے تھے، ان پاک باطن پادریوں نے ان ہی تیروں کو اپنے دل و جگر سے نکال نکال کر ہندوستان میں ناواقف مسلمانوں پر چلانا شروع کیا، اور غایت دیدہ دلیری و بے باکی سے یہ باور کراتے تھے، کہ یہ سارے اعتراضات صرف قرآن اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام پر وارد ہوتے ہیں، اور نہ عیسائی مذہب کا دامن ان تمام مطاعن سے پاک ہے،

خود مولینا کے بیان سے بھی معلوم ہوتا ہے، کہ ان اعتراضات کا علم آپ کو ان ہی پادریوں کے ذریعے ہوا، جیسا کہ دیباچہ ہی میں لکھتے ہیں،

"اتفاقًا پادریوں سے وہاں (بنارس) کے ایکدن اتفاقِ مباحثہ ہوا"

مباحثہ کا اتفاق تو کل ایک دن ہوا، لیکن غضب یہ ہوا کہ حریف کی روشن گہری کا صحیح اندازہ کئے بغیر کسی مسکین پادری نے ایک رسالہ بھی آپ کے حوالہ کیا، جس میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر اعتراضات کئے گئے تھے، لکھتے ہیں:-

"بالآخر انھوں نے (یعنی پادری صاحب نے) ایک رسالہ جسکو کسی پادری نے ...... بطلان رسالت خاتم النبیین شفیع المذنبین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرزاپور میں منطبع کیا ہے، اس خاکسار کے حوالہ کر کے کہا کہ اس کا جواب لکھو"

کچھ نہیں معلوم کہ یہ رسالہ کون سا تھا، کہ اندازہ ہوتا کہ اس میں کیا کیا باتیں تھیں، اگر بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ بالکل معمولی تھا، خود ہی لکھتے ہیں،

"چونکہ وہ رسالہ قابل التفات نہ تھا، چنانچہ یہ بات اوپر ناظرین اسکے پوشیدہ نہیں"

رسالہ کے ناقابلِ التفات ہونیکی وجہ سے آپ نے پادری کے "چیلنج" جواب لکھو کو تو نا منظور کر دیا، لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے، کہ وہ سارے مباحث و عنوانات جن سے اس کتاب میں بحث کی گئی ہے، اس کا ابتدائی سرمایہ یہی رسالہ تھا، اور اسی کے مضامین کی دلچسپیوں سے آپ کو اس عہد کے مشہور مسیحی یوروپین علما، فنڈر اور اسمتھ کی کتابوں کے مطالعہ کا بھی موقع ملا جیسا کہ ایک موقعہ پر لکھتے ہین:-

"رسالہ میزان الحق پادری فنڈر اور تحقیق دین حق پادری اسمٹ صاحب کی جو مناسب مباحث اس رسالہ کی تھین، ان سے بحث کی گئی"

بہرحال سرکار انگریزی کے ایک ہندوستانی افسر کے گھر میں پیدا ہونا یا بنارس میں ایک دن پادری سے اتفاقیہ طور پر بحث کرنا یا مرزا پور کے مجھول الاسم والکتاب پادری کی کتاب دیکھنا یا فنڈر و اسمٹ کی کتابوں کا مطالعہ کرنا ہی وہ کچھ اسباب ہیں، جنھوں نے آج سے سو برس پیشتر آپ کے دماغ کو ان سوالات و شکوک اور ان کے جوابات کی طرف منتقل کیا، جنھیں آج ہم جدید علم کلام کے نام سے منسوب کرتے ہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ خود اپنی ذاتی کاوشون و دماغی کوششوں یا مصر و قسطنطنیہ کے علمار کی امداد سے ہندوستان کے قدیم و جدید طبقہ نے مختلف پیرایوں میں تقریباً پچاس سال کی مدت میں مختلف صوبوں سے اسلامی اصول کی تائید میں آج جو جوابات پیش کئے، یا کر رہے ہیں، حیرت ہوتی ہے، کہ ان میں سے اکثر مسائل کے عمیق و دقیق پہلوؤن تک مولانا کا ثاقب ذہن ایک صدی پہلے پہنچ چکا تھا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بعض باتیں اس کتاب میں ایسی بھی ہیں کہ جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے، کہ اسوقت تک وہ صرف انکا مخصوص حصہ ہے،

مضامین کی وثاقت و بلندی، مقدمات کی استواری و ترتیب معلومات کی وسعت و تنقیح، عبارت



کی سنجیدگی و متانت ان سب کا صحیح اندازہ تو اصل کتاب کے پڑھنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے، بشرطیکہ پڑھنے والا تھوڑی دیر کے لئے اپنے کو آج سے ایک صدی پہلے کی اردو زبان پڑھنے پر راضی کر سکتا ہو، کیونکہ موجودہ طریقہ انشا و بیان کے عادیوں کے لئے سب سے بڑا صبر آزما کام یہی ہوجاتا ہے، اور اسی عبارتی لذت کی بدعادت نے ہمیں قدیم بزرگون کے اکثر افادات سے محروم کر رکھا ہے، لفظوں کے جال میں موجودہ نسل کی پیداوار کچھ اس طرح الجھ پڑی ہے کہ معنی کے آبِ روان اور درِ منثورہ تک پہنچنے کی ہمت باقی نہیں رہتی، تاہم ناظرین کے سرسری اندازہ کے لئے مضامین کتاب کی ایک اجمالی فہرست مختصر تبصرہ کے ساتھ پیش کیجاتی ہے،

سب سے پہلے مولانا مرحوم نے اس کتاب میں اس دعوی کو حل کیا ہے، کہ اسلام کے سوا چونکہ دنیا کے تمام مذاہب اپنا تاریخی ثبوت کھو چکے ہیں، اسلئے،

"بدونِ تصدیق رسالت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی سبیل تصدیق انبیاء ماسبق کی نہیں"

لیکن آپ کے سامنے چونکہ اس وقت یورپ اور اس کے مذاہب تھے، اسلئے آپ نے نہایت بسط و تفصیل سے پہلے یورپ کے دونوں مذہب یعنی عیسائیت و یہودیت کی تاریخ لکھی ہے، ابتدا میں ان دونوں مذاہب کے دینی وثیقون اور مستندات کی فہرست دی ہے، عربی، فارسی، انگریزی، عبری میں ان کتابوں کے جو نام ہین انھیں درج کرکے اپنے دعوی کے ثبوت میں اندرونی و بیرونی شہادتوں سے ایک ایسی روشنی مہیا کی ہے، کہ جس کے سامنے آنے کے بعد آج جن اساسوں پر ان مذاہب کی بنیاد قائم ہے ایکایک درہم برہم ہو جاتے ہیں، تورات کے متعلق بیرونی شہادتوں کے سلسلہ میں آپ نے یورپ کے بڑے بڑے علما کے اقوال مع دلائل نقل کئے ہیں، خصوصاً اسمٹ، ٹیلر، رابرٹ وغیرہ کے کلام سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے، اسی طرح اندرونی شہادتوں کے ذیل میں خود تورات کی ایسی آیتیں پیش کی ہیں، جنسے عیاناً یہ بات واضح ہو جاتی ہے، کہ جن انبیار کی طرف یہ کتابین منسوب کیجاتی ہیں، خود ان کتابوں کی آیتیں گواہ ہیں، کہ یہ انتساب قطعاً غلط ہے، آخر میں عہد عتیق کے مجموعہ کے متعلق آپنے

اپنا آخری فیصلہ ان عجیب وغریب تشبیہون کیساتھ درج کیا ہے،

"اصل حقیقت یہ ہے کہ موسی کی کتاب ایسی ہے، جیسے کوئی کسی تفسیر مثلاً تفسیر حسینی کا ترجمہ اردو کرڈالے اس طرح کہ قرآن کی عبارت نہ لکھے، بلکہ صرف اسکا ترجمہ کرکے لکھے،[1] اور کتابیں (یعنی موسی کی کتاب کے سوا) ایسی ہیں، جیسے ہمارے یہاں معارج النبوۃ، یا معراج نامہ، یا مولد نامہ، یا قیامت نامہ کہ جس میں قرآن اور احادیث کے الفاظ لیکر یہ کتابیں بنائی گئی ہیں، اور بعضے مثل حاتم طائی کی ہفت سیر اور شاہنامہ کے لکھی گئی ہیں۔"

جاننے والے جانتے ہیں کہ آپ نے اپنے اس فیصلہ میں اسلامی عدل کے قرآنی حکم اعدلوا هو اقرب للتقوی، سے سرمو تجاوز نہیں فرمایا ہے، اس کے بعد آپ نے عہد جدید کی کتاب انجیل کو لیا ہے، اور ٹھیک اسی طرز سے اس پر بھی بحث کی ہے، عیسائیوں کے اس دعوی کی تغلیط کیلئے کہ لکھنے والون نے اپنی اپنی انجیلیں روح القدس کی امداد سے لکھی ہیں، آپ نے چارون انجیلوں کی متناقض عبارتوں کا ایک محاذاتی نقشہ پیش کیا ہے، جس کے دیکھنے کے بعد بآسانی معلوم کیا جاسکتا ہے، کہ ان چار مختلف باتون میں سے صرف ایک ہی بات صحیح ہوسکتی ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے، کہ جن کتابون میں ایسی صریح غلطیان ہون ان کو روح القدس کی طرف منسوب کرنا خود عیسائیوں کی غلطی ہے، اور پھر آخر میں عہد جدید کے متعلق اپنا فیصلہ اس متانت اور سنجیدگی کیساتھ ان لفظون میں پیش کرتے ہیں،

"اصل حقیقت یہ ہے کہ تالیف اناجیل، مثل ملفوظات بزرگون کے ہے، کہ جس میں اون کے نشست و برخاست کے قصے اور اون کا نسب نامہ اور سلسلہ اور اون کی تقاریر مندرج ہوتے ہین۔"

[1] یعنی آپ کی رائے تورات کے متعلق یہ ہے، کہ اصل کتاب کیساتھ شارحین تورات کی تشریحی عبارتیں اور توضیحی اضافے بھی جزو کتاب سمجھے گئے ہیں، غالباً مسلمان مصنفوں میں ایسی منصفانہ اور اقرب الی الحق رائے بہت کم لوگوں نے دی ہے۔



فیصلہ کے آخر میں کیسے جچے تلے الفاظ میں اپنی اس رائے کو درج فرماتے ہیں،:-

"مگر اس کے (یعنی انجیل کے) ضمن میں جو کلام عیسوی منقول ہے اگرچہ وہ بلفظہ عیسوی زبان میں نہیں، کیونکہ حضرت عیسٰی علیہ السلام بسبب یہودی نژاد ہونے کے عبری بولتے تھے، لیکن جائز ہے کہ وہ کلام الٰہی کا ترجمہ ہوئے۔"

مجموعۂ بائبل کے متعلق اپنی اس رائے کے بعد آپ کی نظر ان اختلافات کی طرف بھی گئی ہے، جو کہیں کہیں قرآن اور بائبل کے مضامین میں نظر آتے ہیں، آپ نے اس باب میں ایک عجیب مسلک پیش کیا ہے، فرماتے ہیں

"جس طرح کی تاویل بعضے انجیل کے جملون کی اپنے اصول موضوعہ کی صحت کے لئے عیسائی کرتے ہیں، اُس سے کم تاویل میں وہ جملے قرآن کے موافق ہوسکتے ہیں"،

نہ صرف یہودیون، اور عیسائیوں، بلکہ دنیا کے وہ تمام مذاہب جنکی ابتدا تاریخ کے عہد تاریک میں ہوئی اور سامان حفاظت کی کمی نے ان کے دینی وثائق کو اپنے اصلی حال پر باقی نہ رہنے دیا، قرآن کی روشن اور تابناک تاریخی ثبوت کے نور میں اپنی تصحیح اس ٹھوس اور منصفانہ تجویز کی بنیاد پر کتنی آسانی سے کرسکتے ہیں، یقیناً مشکوک و مشتبہ متون کی تصحیح کی یہی صورت ہوسکتی ہے، اور آج دنیا کے کس مذہب کو اسکی ضرورت نہیں؟ کتنے افسوس کی بات ہے جس قرآن کا تعلق دنیا کے سارے مذاہب اور انبیا، سے صرف تصدیق و تصحیح کا تھا، نادانون نے بلا وجہ اس سے تردیدی و تکذیبی تعلق پیدا کرکے ہنگامہ برپا کر رکھا ہے،

یورپ کے مذاہب کے بنیادی اساسوں کی بحث سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے اسلام کے بنیادی وثیقون کو پیش فرمایا ہے، لیکن جیسا کہ سر ولیم میور نے لکھا ہے، کہ قرآن کا تاریخی طور پر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف منسوب ہونا ہم عیسائیوں کے نزدیک بھی اسی قدر قطعی ہے، جس طرح مسلمان اسکو خدا کا کلام قطعی طور پر سمجھتے ہیں، اسلئے قرآن کے تاریخی پہلو پر بحث کرنے کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے، صرف اسکے مضامین کی اندرونی شہادتون پر آپ نے قناعت کی ہے، قرآنی مضامین کی افادی حیثیت کے متعلق لکھتے ہیں، اور کس قدر جامعیت سے کل

بیس نمبروں میں تیس پاروں کا خلاصہ پیش کرتے ہیں،

"کوئی رکوع بلکہ کوئی پنج آیت بلکہ کوئی آیتِ متوسطہ خالی نہیں ہے، جس میں امور مفصلۂ ذیل

سے کوئی نہ کوئی بات نہ ہو"

(۱) حضرت مبدأ جل شانہٗ کی صفاتِ کاملہ کا بیان (۲) ترغیب ذکر الٰہی (۳) نصیحت تقویٰ الٰہی (۴) تاکید رجوع الی اللہ درہر امر (۵) نصیحت تہذیب اخلاق مجملاً، (۶) ستایش اخلاق مثل حلم و تواضع و عفت و کرم و سخاوت وشجاعت و عفو و سماحت (۷) نکوہش اخلاقِ رذیلہ مثل تہور و جبن و وقاحت، و بخل، و کبر و ظلم و اتلاف، (۸) ترغیب بہ توکل و زہد، و قناعت و اخلاص و حریت، (۹) تہدید از ریا و سمعہ و عجب، و تملق، و چاپلوسی و حرص، و حب دنیا، (۱۰) ترغیب محبت مع اللہ و اہل اللہ (۱۱) تہدید از صحبت بے دینان، و اربابِ جہل مرکب (۱۲) مسائل تدبیر منزل، (۱۳) سیاستِ مدنیہ، (۱۴) ذکر خیر حضرات انبیا علیہم السلام، (۱۵) نکوہش دشمنانِ آنہا (۱۶) حکم بایمان آوردن بعیسیٰ و موسیٰ و غیرہما انبیا بنی اسرائیل و ابراہیم، و نوح و غیرہما، از انبیا پیشین خصوصًا و عمومًا علیٰ نبینا و علیہم الصلوٰۃ والسلام (۱۷) سخنانِ معرفت و حقیقت، کہ موثر قوی، برائے وصول الی اللہ باشد، (۱۸) ذکر معاد انسانی و لذت و الم جاودانی، از برزخ تا جنت و نار، (۱۹) ذکر بے ثباتی ارکانِ عالم، (۲۰) دعوت بہ توحید الٰہی"

ان مضامین پر قرآن کا مشتمل ہونا، اور پھر فصاحت و بلاغت کے انتہائی معیار پر اسکی ہر آیت کا کھرا ہو کر نکلنا، اسکے متعلق فرماتے ہیں،

"ظاہر ہے کہ بیان خط و خال، قد و بالا، ناز و ادا، شادی و غم، ہجر و وصل، شراب و کباب، بزم و رزم، باغ و صحرا وغیرہ، مضامین جن میں فصاحت و بلاغت، اور صنائع و بدائع، معانی بیان کی گنجایش بہت ہوا کرتی ہے، نہ کہ اس میں جس میں مبدأ اور معاد کے صفات اور حالات اور قوانین عبادات و معاملات، تمدن و سیاسیات، سراپا حکومت کی باتوں میں ہے، اور معہذا معانی و بیان کے قواعد و محسنات بدیعیہ کے لطائف باحسن وجوہ اس میں مرعی ہیں،،



آپ نے اوس کو محدود قوت والے انسان کی پرواز سے بالاتر ٹھہرا کر صرف غیر محدود کلامی قوت کا مظاہرہ قرار دیا ہے، اور یہی آپ کے نزدیک اعجاز قرآنی کی اندرونی اور ہمیشہ باقی رہنے والی ابدی شہادت ہے، جب تک دنیا میں قرآن موجود ہے اس اعجازی وجہ کو اس سے کوئی جدا نہیں کر سکتا، قرآن کے ساتھ آپنے اسلام کے دوسرے سرچشمہ یعنی حدیث پر بھی بحث کی ہی، یہ بحث ذرا طویل ہے، لیکن جستہ جستہ مقامات سے اسکی بعض چیزیں یہاں درج کیجاتی ہیں، فرماتے ہیں،

"ہمارے یہاں ایک عظیم الشان فن مقرر ہوا ہے، اور اس فن کے بیسیوں، بلکہ سیکڑوں دانا لوگ ایسے گذرے ہیں کہ ان کی وثاقت، اور ان کی اس فن میں مہارت جتنے اہل علم ہیں سب جانتے ہیں اور جان سکتے ہیں"،

اور آگے چل کر فرماتے ہیں،

"اس فن میں یہ بحث ہے کہ فلانی بات جو فلانے شخص کی طرف منسوب ہے، اس کے ناقل نے بلاواسطہ سن کر لکھا ہے، یا بالواسطہ اور اگر بلاواسطہ ہے، تو وہ ناقل کون شخص ہے، کہاں رہتا تھا، کب پیدا ہوا کب مرگیا، فضول گو تھا، یا راست گو تھا، مغلوب النسیان تھا، یا حافظہ والا، صاحبِ تفتیش تھا، یا سفاہت والا، اور اپنے بیان میں مضطرب تھا، یا مستقل اور اسکے مذہب میں تمیز بین الحق والباطل کی جگہ تلبیس بین الحق والباطل جائز تھا، یا ممتنع"،

اہل علم اندازہ کر سکتے ہیں، کہ رواۃ حدیث کے صفات کو اردو زبان میں مصنف نے کس قدر منقح شستہ پیرایہ میں ادا کیا ہے، پھر حدیث کی مختلف قسموں، متواتر، مشہور، آحاد کی تعریف اور علمی نتائج کے درج کرنے کے بعد فرماتے ہیں،،

"اور اگر ہر طبقہ میں اس کے متعدد ثقہ راوی نہیں تو دیکھا جاتا ہے کہ آیا بداہت عقل کے خلاف کوئی بات اس میں ہے، یا نہیں، اگر بداہت عقل کے خلاف ہے، تو وہ بھی کالم یکن متصور

ہوتی ہے یعنی اُسے یہ سمجھتے ہیں، اگر کسی نے سہو سے یہ بات بڑھادی، یا گھٹا دی یا اوسکی تاویل عرف

کے موافق کچھ کیجاتی ہے، جیسے عیسائی لوگ تورات کی اس روایت کی کہ سرزمین کنعان میں دودھ اور

شہد کی ندیاں بہتی ہیں" کرتے ہیں؛

حدیث کے ان ظنی حصوں کے متعلق یہ لکھکر کہ علاوہ بداہتہً عقل کے اگر قرآن یا متواتر خبروں کے بھی وہ مخالف ہو، تو فنی طور پر محدثین اسکو بھی رد کردیتے ہیں، آپ لکھتے ہیں،

اور اگر ان دو قباحتوں میں سے کوئی قباحت اس میں (حدیث) میں نہ ہوے، تو دیکھا جاے کہ آیا تفصیل ہے، انھیں قطعیات کی تو اوس کی بھی تصدیق کرتے ہیں، جیسے سخاوت، اور صبر تحمل وزہد، توکل کے فضائل وغیرہ، اور اگر ان قطعیات کی تفصیل نہیں ہے، بلکہ ایک الگ بات ہے، تو اگر سب راوی اس کے ثقہ ہیں، اور بیچ میں کہیں سے سلسلہ منقطع نہیں ہوا ہے، اور اوس کے معارض کوئی ایسی روایت نہیں ہے، سو اگر عملیات میں ہے، تو بظن غالب واجب العمل ہوتی ہے، جیسے اکثر مسائل، نماز، روزہ، بیع و رہن وغیرہ کے، اور منجملہ اعتقادات کے ہیں، تو بظن غالب اس کا ماننا بھی ہوتا ہے، نہ بر سبیل جزم و یقین"

اگر خود اس قسم کی حدیثیں باہم ایک دوسرے کی ضد ہوں، تو اس کے متعلق آپ نے اس عجیب مسلک کو پیش کیا ہے،

"اور اگر ایسی روایتیں بہمہ گر مختلف ہوتی ہیں، سو اگر منجملہ عملیات ہے، تو احد الروایتین پر عمل کرنے کیلئے ترجیح ظنی دیکھا جایا کرتی ہے، اور اگر یہ حاصل ہو تو فبہا، ورنہ جیسر چاہا عمل کیا اور اگر منجملہ نظریات ہے تو کسی جانب عقیدہ نہیں باندھا جاتا؛"

آج معمولی فروعی مسائل مثلاً آمین، رفع الیدین، قرأۃ فاتحہ وغیرہ کے متعلق ان ہی اختلافی ظنی حدیثوں کی بنیاد پر ہندوستان میں جو لیات و خرافات کا ایک سلسلہ چھڑ گیا ہے، اردو زبان کے ایک قدیم مصنف نے کتنی



آسانی کیساتھ اُسے کس طرح طے کردیا ہے، فجزاہ اللہ عنا خیر الجزاء،

حدیث کی ان تاریخی استواریوں، اعتماد کی عقلی بنیادوں کے استحکامات کو دکھانے کے بعد آپ نے یورپ کو چیلنج دیا ہے، کہ قرآن تو خیر حدیث ہی کے مقابلہ میں تم اپنی اسامی کتابوں کے کسی ایک فقرہ کے متعلق اس قسم کا کوئی ثبوت بہم پہنچا سکتے ہو، فرماتے ہیں:۔

"تورات کی سندیں انبیاء منسوب علیہم سے بطلیموس کے وقت تک اور انجیل کی حضرت عیسیٰ سے قسطنطین تک کے لکھ دیجئے"

آخر میں لکھتے ہیں، اور کس قدر سچ لکھتے ہیں، دنیا کے تمام مذاہب کو اس سے عبرت پذیر ہونا چاہئے،

"اور فقط یہ کہنا کہ یہ کتاب الہام سے لکھی گئی ہے، اس واسطے واجب التسلیم جاننا چاہئے، تو مؤلف حاتم کی ہفت سیر اور داستان امیر حمزہ کا بھی یہی کہہ سکتا ہے"

اسلام اور اس کے مسائل و قوانین کی ان دونوں بنیادی یادداشتوں پر بحث کرنے کے بعد ضرورت نہیں رہتی، کہ قرآن وحدیث کی طے شدہ شکلیں جن کا نام فقہ و تصوف ہے، مؤلف علام بحث کرتے، لیکن مسیحی علم کلام کے متعلق ڈاکٹر ٹیلر کی اس راے کو درج کرنے کے بعد،

"کہ ابتدا میں ان قابل شخصوں (یعنی مسیحی متکلمین) کے سبب سے بھی جنھوں نے قصد کیا احکام دین مسیح کو گبروں کے حکماء کی حکمت سے تطبیق دیں، مسیحی کلیسا نے بہت ضرر اوٹھایا"

مولینا مرحوم نے مسلمانوں کے علم کلام کو بھی اسلام کے لئے ایک بلا قرار دیا ہے، فرماتے ہیں:۔

"بعض علمائے اسلام بھی اس بلا میں بمقتضائے لتتبعن سنن الذین من قبلکم میں پڑے" (باقی)

# پروفیسر بیکر کیساتھ چند دن

از

ازجناب ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ ایم اے پی ایچ ڈی پروفیسر گورنمنٹ کالج جھنگ پنجاب،

اگرچہ بزمانہ قیام یورپ بلحاظ ایک طالب علم کے میرا تعلق لندن یونیورسٹی کیساتھ تھا، جہان پروفیسر آرنلڈ مرحوم کی ذات مستجمع الصفات مجھے کشان کشان لیگئی تھی، مگر اس تمام عرصہ مین خصوصًا پروفیسر موصوف کی وفات حسرت آیات کے بعد جرمنی ہی میرا روحانی مسکن (Spiritual home) رہا، جہان مین اکثر دفعہ بالخصوص تعطیلات کے دوران میں بھاگ جایا کرتا تھا، پہلے سال جب ہائڈل برگ کے طویل قیام اور دیگر مقامات کی سیر کرتا ہوا برلن پہنچا، تو وہان کے علمی ادارون اور مخفلون عجائب خانون اور کتب خانون یونیورسٹی کے اساتذہ اور ان کے خطبون، اور علاوہ بران دیگر روحانی علائق نے دامن دل کو اس طرح کھینچا، کہ ایک مدت تک وہیں کا ہو رہا،

نزلنا علی ان المقام ثلثۃ  فطابت لنا حتی اقمنا بھا شھرا

غرض وہان ایک طرف علماء و فضلاء کی ملاقاتین تھی، اور علمی تذکرے، اور دوسری طرف "Femina" اور "Hans Vaterland" کی طرب انگیز فضاء کی سرمستیان اور "Yang Halle" کی دلچسپیان اور رنگینیان، یہان موخر الذکر مقامات سرور و سرود کی پر لطف جلوہ باریون کا نقشہ کھینچنا مقصود نہیں، شاید وہ پر لطف کیفیتیں کسی اور جگہ نہان خانہ دل سے صفحہ قرطاس پر اتریں، یہان مجھے ارباب "معارف" اور مقاصد "معارف" کی رعایت سے صرف پہلی قسم کے خشک موضوع پر کچھ عرض کرنا ہی،



اگرچہ وہان متعدد علماء و فضلاء مثل (Kampfmeyer، Willmoch، Schaeder، Weil اور Ruska) کی صحبت سے کم و بیش مستفید ہوتا رہا، مگر افسوس کہ پہلے سال مشہور اور ممتاز جرمن مستشرق پروفیسر ڈاکٹر بیکر (C. H. Becker) کی ملاقات سے محروم رہا، کیونکہ وہ اُن دنوں امریکہ کی سیر و سیاحت کیلئے تشریف لیجا چکے تھے، دوسرے سال اپریل سنہ ۱۹۳۱ء میں جب میں پھر برلن پہنچا تو نہ صرف پروفیسر موصوف وہان موجود تھے، بلکہ میری خوش قسمتی سے برلن یونیورسٹی بھی موسم بہار کی تعطیل کے بعد کھل چکی تھی، اور لکچرون کا سلسلہ جاری ہو چکا تھا، چونکہ پروفیسر بیکر کی تصانیف کے مطالعہ سے بوجہ ان کے تبحر علمی، دقت نظر اور وسعت خیال کے مجھے اُن سے ایک عرصہ سے غائبانہ عقیدت پیدا ہو چکی تھی، اسلئے اکثر اوقات ان کی خدمت میں حاضر رہا، چنانچہ اس مختصر مضمون میں انہی چند ہفتون کے تاثرات اور دیگر متفرق واقعات کا قلمبند کرنا مقصود ہے، شاید ناظرین معارف کی دلچسپی کا موجب ہون،

پروفیسر بیکر جن کا صد افسوس کہ اب انتقال ہو چکا ہے، جرمنی کے اُن چند چوٹی کے سربرآوردہ علمائے مستشرقین میں سے تھے، جنھون نے اس بیسویں صدی میں اسلامیات اور خصوصًا اسلامی تاریخ کی تحقیق و تفتیش اور تعلیم و تدریس کے ذریعہ سے بیش از بیش خدمت سر انجام دی ہی، طالب علمی کے زمانہ میں وہ متعدد یونیورسٹیوں میں بہت سے جید اساتذہ سے فیضیاب ہوئے، اور بالخصوص ولہاوزن (Wellhausen) کے مصنفات اور خیالات سے متاثر ہو کر انھون نے اپنے آپ کو اسلامیات کے مطالعہ کیلئے ہمہ تن وقف کر دیا، بحیثیت مصنف کے اُن کی علمی سرگرمی بیسویں صدی کے آغاز ہی سے شروع ہوتی ہے، جب انھون نے ابن الجوزی کی سیرت عمر بن عبد العزیز اصل عربی میں شائع کر کے ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کی، اس کے بعد وہ ہائڈل برگ میں پروفیسر مقرر ہوئے، پھر ہامبرگ (Hamburg) کی کولونیل انسٹی ٹیوٹ میں اسلامی تاریخ کے پروفیسر رہے، پھر بون (Bonn)

چلے گئے، پھر بوجہ اپنی علمی شہرت اور کارگذاری کے برلن کی مرکزی شاہی یونیورسٹی میں بحیثیت پروفیسر اعلیٰ متعین ہوئے، پھر یہیں برلن میں زمانہ مابعد جنگ میں ۱۹۳۰ء تک چھ سات سال تک وزارت تعلیم کے جلیل القدر عہدہ پر فائز رہے، اور جرمن یونیورسٹیون میں کئی ایک اصلاحات نافذ کین، اور متعدد علمی اداروں کی تنظیم کی، اور بعض نئے شعبے قائم کئے،

جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، تو اس وقت وزارت تعلیم سے مستعفی ہو کر یونیورسٹی میں واپس آچکے تھے، اور باقاعدہ تعلیم وتدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، وہان یہ دستور ہے، کہ ہر پروفیسر کے ایام تعلیم میں ہفتہ میں ایک دو گھنٹے (Sprechstunde ?) ایسے ہوتے ہیں، جبکہ وہ ایک مقررہ مقام پر اپنے شاگردون اور دیگر ملاقاتیون کیساتھ گفتگو و کلام کیلئے فارغ ہوتا ہے، چنانچہ میں نے بھی پروفیسر موصوف سے ابتدائی ملاقات ایسے ہی وقت میں کی، نہایت خوش خلقی سے پیش آئے، اور جب میں نے بتلایا کہ مجھے پروفیسر آرنلڈ سے شرف تلمذ حاصل رہا ہے، تو اور بھی لطف اور مہربانی کا اظہار فرمایا، پھر میرے علمی شغل کے متعلق دریافت فرمایا، میں نے کہا کہ میں عرب کی معاشرت اور تاریخی ارتقاء پر وہان کی آب وہوا، اور جغرافی طبعی ماحول کے اثرات کا مطالعہ کر رہا ہون، تو اظہار پسندیدگی فرمایا، اور مجھ سے دریافت کیا کہ تم نے اس مضمون کو کس طرح شروع کیا ہے، مین نے اس کا ہلکا سا خاکہ مختصر الفاظ میں کہہ سنایا، تو بہت پسند کیا، اور کہا یہ محض ایک خشک لغوی بحث نہیں، بلکہ ایک عام فہم اور دلچسپ مضمون ہے، جس میں محنت کے علاوہ ذہانت فکر دکھانے کے لئے کافی میدان موجود ہے، اور ساتھ ہی مجھ سے خواہش ظاہر کی، کہ مضمون کی تکمیل کے بعد ایک نسخہ اس کا اون کے مطالعہ کے لئے ارسال کرون، افسوس کہ اون کے ارتحال ناگہانی نے اُنکے ارشاد کی تعمیل کا موقع نہ دیا،

پھر مجھ سے دریافت کیا کہ کیا تم مسٹر عبد العلیم کو جانتے ہو، میں نے عرض کی، کہ نہیں، فرمایا کہ وہ تمھارے ہی ملک ووطن سے آئے ہیں، اور ہماری یونیورسٹی میں مصروف تحصیل ہیں، ہم نے اُن کیلئے عقیدہ اعجاز القرآن



کا مضمون انتخاب کیا ہے، جسکی تحقیق میں ان کے ٹھیٹھ اسلامی عقائد کیساتھ معارضہ پیدا نہ ہوگا، عبد العلیم صاحب ان دنون برلن سے باہر تشریف رکھتے تھے، اسلئے ہمیں ان کی ملاقات کا شرف ہندوستان ہی میں واپس آکر حاصل ہوا، جب کہ وہ پورے ڈاکٹر بن چکے تھے، ہمیں یہ دیکھکر مسرت ہوئی، کہ پروفیسر ہکیر ہمارے نوجوان ہندوستانی ہم وطن کی لیاقت وقابلیت کے معترف تھے،

مجھے ڈاکٹر ہوروویتز (پروفیسر فرانکفرٹ یونیورسٹی) کے انتقال کی خبر ان ہی کی زبان سے معلوم ہوئی، کہا کہ یونیورسٹی جا رہے تھے، راستہ میں حرکت قلب بند ہونے سے یکایک گر کر مر گئے، وہ انکی ناگہانی موت پر بہت افسوس کرتے تھے، اور ساتھ ہی تعجب بھی کرتے تھے، کہ ابھی وہ بوڑھے تو نہ تھے، میری ہی عمر کے لگ بھگ ہون گے، انھیں کیا معلوم تھا، کہ دو سال کے قلیل عرصہ مین وہ بھی اپنے قدردانون کو وقف ماتم کرنے والے ہیں،

پھر متعدد ملاقاتون میں اپنی مختلف تصانیف کا ذکر کرتے رہے، ایک دن فرمایا کہ مین نے پچھلے سال پیغمبر اسلام (Der Prophet) کی سیرت پر ایک سلسلہ لیکچرون کا دیا تھا، جسمین یہودی عیسائی، اور مسلمان سبھی مذاہب کے سامعین شریک تھے، میں نے مضمون اسطرح نبھایا کہ اس سے سبھی لوگ مطمئن رہے، اور علاوہ ازین ان خطبون کے دوران میں خود مجھ پر آنحضرت ﷺ کی شخصیت کا ایک ایسا تصور منکشف ہوا، جس اس سے پہلے میرے ذہن میں کبھی پیدا نہیں ہوا تھا، افسوس کہ وہ خطبے جہان تک مجھے علم ہے، معرض طبع میں نہیں آئے، ورنہ انکی فاضلانہ تحقیق وتلاش اصابت راے اور وسعت خیال کی ایک عمدہ مثال باقی رہ جاتی،

جب مین نے ان سے کہا کہ اسلامی تاریخ سے مجھے خاص شغف ہے، تو فوراً ایک جذب بھری آواز میں بول اُٹھے، کہ پھر تو تمھیں یہاں ہماری یونیورسٹی میں ہونا چاہئے تھا، اُس سے اُن کی یہ مراد تھی کہ ہم یہان اسلامی تاریخ کے مطالعہ پر خاص زور دیتے ہیں، اور تمھیں یہان ہماری نگرانی میں اپنا حوصلہ

نکالنے اور شوق پورا کرنے کا کافی موقعہ ملتا، ان کا کہنا درست تھا، اور میں اپنی محرومی پر افسوس کرکے رہ گیا،
اسکے بعد اونھوں نے مجھے اپنے تمام لیکچروں میں حاضر رہنے کی بخوشی اجازت دی، اور میں چند ہفتوں تک
اون سے مستفید ہوتا رہا،

ان دنوں وہ علاوہ دیگر مضامین کے خلفاے راشدین کے عہد کی سیاسی تاریخ پر بھی لیکچر دے رہے
تھے، یہ سلسلہ ان کا اچھا خاصہ ہر دلعزیز تھا چنانچہ ایک سو سے زیادہ مختلف درجوں کے طالب علم شریک درس
رہتے، میں نے دیکھا کہ صدر اسلام سے بحث کرتے وقت وہ اکثر مشہور اطالی مستشرق پرنس کاتانی کا حوالہ دیتے
تھے، اور حق بھی یوں ہے کہ اسلام کے دور اول کے متعلق جس جامعیت تفصیل اور دقت نظر کے ساتھ کاتانی
لکھ چکا ہے، اس پر تاحال مزید اضافہ کی بہت کم گنجایش ہے، لندن یونیورسٹی میں بھی پروفیسر گب اکثر اسی
پر استناد کرتے ہیں،

علاوہ ازیں ایک خاص جماعت کو پروفیسر بکیر ان دنوں قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج کا درس
دے رہے تھے، طریقہ تعلیم یہ تھا کہ ایک طالب علم کتاب پڑھتا جاتا، اور ساتھ ساتھ ترجمہ کرتا جاتا، استاد جہان
مناسب سمجھتا، اصلاح کرتا، مشکل مقامات پر زیادہ وقت صرف کرتا، جہان کوئی مبہم عبارت آتی، تو دیگر عربی
و تاریخ کے متون کی طرف رجوع کرکے اس کے صاف کرنے کی کوشش کرتا، پھر کتاب کے نفس مضمون یعنی روایات
کے محل استعمال و استدلال سے بحث کرتا،

"Semitische Abteilung" میں مجھے اُن کی "Seminar Klasse"
میں حاضر رہنے اور درجہ اعلیٰ کے طالب علموں کیساتھ اُن کے طریق تعلیم کے دیکھنے کا بھی موقعہ ملا، اس درجہ
میں ابھی کام کی ابتدا تھی، سب سے پہلے ایک دن طلبہ کے درمیان مضامین کی تقسیم ہوئی، مختلف طلبہ نے
مختلف مضامین اپنے لئے اختیار کئے، تقریباً سب مضامین پروفیسر بکیر نے خود تجویز کئے تھے، جب تمام مضامین
کی تقسیم ہو چکی تو ایک مضمون "الاسلام فی الحبشہ" کا رہ گیا، مضمون کی دقت اور مواد کی کمی کے باعث کسی کو



اُسے اختیار کرنے کی جرأت نہ ہوئی، اور بالآخر پروفیسر موصوف نے کہا کہ اچھا یہ مضمون میں خود لیتا ہوں آنکے
شوق کار کی داد دینی چاہئے، کہ اپنے طلبہ کو کام تقسیم کرتے ہوئے، باوجود اپنی دیگر گوناگون مصروفیتوں کے
ایک مضمون خود بھی اپنے ذمہ لیلیا،

پھر ایام مابعد میں انہی طالب علموں کے ساتھ فرداً فرداً ان کے مضامین کے متعلق گفتگو کرتے
رہے، اور طریق کار، تلاش مواد اور اوس کے استعمال کے متعلق ہدایات اور
اس سے متعلقہ کتابوں کا حوالہ دیتے رہے، ایک دن ایک طالب علم کو آپ نے ایک انگریزی کتاب کا پتہ
بتایا، اوس نے دبی زبان مین انگریزی زبان سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا، آپ نے بڑے تعجب سے کہا کہ علوم
مشرقی کے درس و مطالعہ کا دعویٰ اور انگریزی سے ناآشنائی، اس کے کیا معنی؟ تم لوگوں کو فرانسیسی
اور انگریزی ضرور جاننی چاہیئے، ان زبانوں میں مشرقیات پر وسیع لٹریچر موجود ہے، اور اس سے اعتنا
کئے بغیر تمھارا گذارا نہیں، علاوہ اور جتنی زبانیں سیکھو مفید ہیں، پھر اپنی مثال دی اور کہا کہ میں نے ڈچ
زبان محض پروفیسر ہرخرنیان ( Hurgronje ) کی تصانیف سے استفادہ کرنے کے لئے
سیکھی، اور اطالوی زبان پرنس کاتانی کی یادگار تصنیف ( Monumental Werk )
تاریخ اسلام پڑھنے کیلیئے،

میں اون سے وقتاً فوقتاً مختلف مستشرقین یا اون کی مشہور اور معرکۃ الآراء تصانیف کے متعلق اونکی
ذاتی رائے دریافت کرتا رہتا تھا، چنانچہ ایک دن ( Lammens ) کے متعلق کہا کہ
وہ متعصب ( Prejudiced ) ہے، اور کاتانی بعض معاملات میں رائے قائم کرنے میں حد سے
زیادہ آزاد رو ( Radical ) ہے،

پروفیسر بکیر کی زبان بہت صاف اور اون کا طرز ادا بہت دلنشیں تھا، جس سے سننے والے کے
دل میں اون کا ایک ایک کلمہ اور ایک ایک حرف جاگزین ہو جاتا تھا، اس ضمن میں ایک دفعہ وہ اپنا

ایک قصہ سُناتے تھے، کہ جب میں ہائڈل برگ میں پروفیسر تھا، تو میں نے دیکھا کہ میرے لیکچروں میں علاوہ دیگر طلبہ کے چار پانچ جاپانی طالب علم بھی شریک رہتے ہیں، میں نے اُن سے ایک دن کہا کہ معلوم ہوتا ہے آپ لوگوں کو اسلامیات سے خاص دلچسپی ہے، انھوں نے جواب دیا کہ "جی نہیں، ہمیں آپ کے محبوب موضوع اسلامیات سے دور کا بھی واسطہ نہیں، ہم نو وارد ہیں، اور سائنس کی تحصیل سے پہلے جرمن زبان سیکھنا چاہتے ہیں، آپ کا تلفظ اتنا صاف ہے، کہ آپ کے لیکچروں سے ہمیں آپ کی زبان سیکھنے میں بڑی مدد ملتی ہے"!!

زمانۂ حال کے علم التعلیم کا جدید ترین اور مفید ترین نظریہ یہ ہے کہ استاد طالب علم کے دل و دماغ میں اپنی آرا، اور اپنے خیالات تحکم کے ساتھ ٹھونسنے کے بجائے اس کے ذہن کی اس طرح تربیت کرے، کہ اس کے اپنے قوائے غور و فکر کی نشو و نما ہو، اور وہ سیکھی سکھائی اور سُنی سنائی باتوں کو دُہرانے کی بجائے انسانی ذخیرۂ معلومات اور مجموعۂ افکار میں اپنی استعداد کے مطابق اپنی طرف سے بھی جدید اضافہ کر سکے، تاریخ شاہد ہے، کہ قریب قریب ہر نسل نے انسانی تمدّن کی تعمیر اور دنیائے عقل و فکر کی تشکیل میں کم و بیش حصہ لیا ہے، لہذا آیندہ نسلوں کی تعلیم اس طور پر ہونی چاہیے، جس سے ان کی جدت آفرینی کی قوت ضائع نہ ہو بلکہ اُن کی پوشیدہ قوتوں کے بروئے کار آنے میں سہولت پیدا ہو، میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر بکر اور دیگر روشن خیال اساتذہ اسی اصول پر چلنے کی کوشش کرتے، جب کوئی مسئلہ غور طلب پیش آتا، تو اپنی رائے کے اظہار کیساتھ شاگردوں سے بھی پوچھتے کہ تمھارا کیا خیال ہے؟ اور اس طرح ان کو واقعات سے از خود نتائج نکالنے یا دلیل و حجت لانے کی ہمت دلاتے، جب کسی شاگرد سے کوئی معقول بات سُنتے تو کہتے کہ ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے، یہ بات بھی قرین قیاس ہے (ja das ist auch wahrscheinlich) غرض کہ زمانۂ حال کے روشن دماغ اساتذہ کا یہ طریقہ ہے، کہ اپنے ذاتی خیالات اور قیاسات کی تلقین کی بہ نسبت وہ صحیح اصول تحقیق کی تعلیم پر زیادہ زور دیتے ہیں، جن کے استعمال سے طلبہ از خود صحیح نتائج پر پہنچ جائیں، غالباً اسی سبب سے پروفیسر نولڈکے کسی خاص اسکول (مذہب) قائم کرنے کے مخالف تھے، کیونکہ اس کا یہ نتیجہ



ہوتا ہے کہ ایک خاص جماعت ایک خاص مجموعۂ خیالات کی اس طور پر پابند ہو جاتی ہے کہ اکثر اوقات نئے نئے اور صحیح تر حقائق کے منکشف ہونے میں بڑی رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے،

میں نے یہ بھی دیکھا کہ مغربی یونیورسٹیوں میں اساتذہ ایک دوسرے کے لیکچروں میں بلا تکلف شریک ہوتے ہیں، انھی دنوں میں برلن میں پروفیسر شیڈر (Schaeder) نے ایرانیات پر اپنے لیکچروں کا سلسلہ شروع کیا، جس سے پروفیسر بکر نے مجھے آگاہ کیا تھا، اور اس میں شریک ہونے کو کہا تھا، پہلا لیکچر تمہیدی تھا، جس میں فاضل مقرر نے ایرانیات کی موجودہ حالت پر ایک عام نظر ڈالی، اور پروفیسر نولڈکے کی خدمات کا جنکا کچھ ہی مدت پہلے انتقال ہوا تھا، خاص طور پر ذکر کیا، میں نے قدرے استعجاب سے دیکھا کہ اس لیکچر میں ڈاکٹر بکر اور کئی ایک دیگر اساتذہ بھی شریک تھے، اسی طرح پروفیسر بکر کے لیکچروں میں بعض اوقات دیگر استاذ شامل ہوتے، ان لوگوں کا یہ طرزِ عمل اس لحاظ سے قابلِ ستایش ہے، کہ یہ لوگ تحصیل علم میں تنگ خیالی، جھوٹے عار، اور غلط خود پسندی کو دخل نہیں دیتے، وہ اس سے خوب واقف ہیں، کہ علم کی کوئی انتہا نہیں، خواہ کوئی شخص اپنے شعبۂ خاص میں کتنا بڑا عالم و فاضل کیوں نہ ہو، اسکی حد سے باہر وہ محض ایک طفلِ مکتب ہے، اور اس لئے دوسروں سے استفادہ کرنے میں اس کی فضیلت میں کوئی بٹا نہیں لگ سکتا،

## پروفیسر بکر کی علمی کارگذاری

پروفیسر بکر کی علمی خدمات کے تذکرے میں جو بات سب سے پہلے قابلِ ذکر ہے وہ رسالہ (Der Islam) "الاسلام" کا اجرا ہے، جس زمانہ میں وہ ہامبرگ میں پروفیسر تھے، انھوں نے یہ مجلّہ خاص اسلامی تہذیب و تمدّن کے مطالعہ کیلئے جاری کیا، یہ پہلا علمی رسالہ تھا، جو جرمنی میں خاص اسلامی مضامین کے لیے سنہ ۱۹۱۰ء میں جاری ہوا، اس سے پیشتر یورپ میں صرف "Revue de monde musulman" ہی ایک فرانسیسی رسالہ تھا، جو اسلامی ممالک سے متعلقہ مباحث کیلئے وقف تھا، پروفیسر بکر کی وفات

تک "Der Islam" کی پچیس[۲۵] جلدیں شائع ہو چکی ہیں، اور ان پچیس[۲۵] جلدون مین بیسیون مستند اور قیمتی
مضامین مختلف محققین کے قلم سے جمع ہو چکے ہیں،

پروفیسر بکیر نے کوئی مستقل اور ضخیم تصانیف اپنی یادگار نہیں چھوڑی، مگر اپنے وقت میں وہ اسلامی تہذیب و
تمدن سے متعلق ہر قسم کے مسائل کی بحث و تحقیق میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، اور معاصرین کے درمیان اون کی رائے
کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤن پر، نیز اسلام کے مسائلِ حاضرہ پر
اُن کے بے شمار مضامین اور چھوٹی بڑی تحریریں بہت سے علمی رسالون اور دیگر مجموعون میں بکھری پڑی ہیں،
ان میں سے اکثر مقالات انھون نے اپنی زندگی ہی میں "Islamstudien" کے عنوان سے کتابی
صورت میں جمع کر دیئے تھے، اس مجموعہ کی پہلی جلد ۱۹۲۴ء میں اور دوسری جلد اون کی وفات سے کچھ عرصہ
بیشتر شائع ہوئی تھی، جن مختلف النوع مضامین اور مسائل کو انھون نے اپنی تحقیق و تلاش سے مجلا اور
روشن کیا، ان کے اجمالی ذکر کے لئے بھی ایک طویل مقالہ کی ضرورت ہے، یہان میں صرف اون کی
چند ایک ایسی تحریرون کا حوالہ دینے پر اکتفا کرتا ہون، جو انگریزی زبان میں بھی موجود ہیں، تاکہ ناظرین
میں سے جو شائقین جرمن نہیں جانتے، اون کی طرف رجوع کر کے پروفیسر موصوف کے خیالات اور تحقیقات سے
استفادہ کر سکین،

آپ نے ایک طویل مقالہ عیسائیت اور اسلام کے باہمی مذہبی اور سیاسی تعلقات پر لکھا تھا،
اس کا "Christianity and Islam" کے عنوان سے انگریزی مین
ترجمہ ہو چکا ہے، اور "Harper Bros" نے لنڈن سے ۱۹۰۹ء میں کتابی صورت میں
شائع کیا تھا، یہ مقالہ بہت پُر مغز ہے، شائقین اوس کی طرف رجوع کرین،

علاوہ ازین انھون نے "Camb. Mediaeval History" کی دوسری
جلد میں مشرق و مغرب کی اسلامی فتوحات پر دو باب لکھے تھے، اگرچہ مضمون کی وسعت کے مقابلہ مین



یہ باب مختصر ہیں، مگر صحیح ترین تحقیقات کا نچوڑ ہیں، اور اس لحاظ سے بہت مستند اور قابلِ قدر ہین،

اسکے علاوہ اونھون نے کئی ایک آرٹیکل خصوصًا مصر کی تاریخ کے متعلق انسائیکلوپیڈیا اوف اسلام
کیلئے بھی لکھے تھے، ناظرین ان کو انسائیکلوپیڈیا مذکورہ کے انگریزی اڈیشن میں ملاحظہ کر سکتے ہین، مصر (Egypt)
پر انکا آرٹیکل خاصہ طویل اور جامع ہے،

محولہ بالا مضامین کے علاوہ ناظرین کو خدا بخش صاحب مرحوم کی کتاب "Contribution"
کی دوسری جلد مطبوعہ کلکتہ یونیورسٹی پریس ۱۹۳۰ء کے آغاز میں پروفیسر بکیر کے دو مضامین کا انگریزی
ترجمہ ملے گا،

سب سے اخیر میں ان کی آخری کتاب کا حوالہ دینا چاہتا ہون، جو انھوں نے حسنِ اتفاق سے
انگریزی میں لکھی تھی، اور اون کی وفات کے بعد پچھلے سال شائع ہوئی ہے، اس اجمال کی تفصیل یون ہے
کہ ۱۹۳۱ء میں لیگ اوف نیشنز نے حکومت چین کی درخواست پر وہاں کے تعلیمی مسائل پر غور کرنے، اور
تعلیمی اصلاحات تجویز کرنے کیلئے چار ماہرین تعلیم کی ایک جماعت روانہ کی تھی، ان میں ڈاکٹر بکیر بھی تھے، یورپ
واپس آکر انھون نے دیگر شرکاء کے ساتھ اپنے مشاہدات، اور فراہم کردہ معلومات کی بنا پر ایک رپورٹ
پیش کی تھی، اس کے علاوہ ڈاکٹر موصوف نے لنڈن یونیورسٹی کی انسٹیٹیوٹ اوف ایجوکیشن کی دعوت پر اکتوبر
۱۹۳۲ء میں لنڈن میں ایشیائی ممالک (یعنی چین اور مشرق قریب) کے تعلیمی مسائل پر تین لیکچر دئے تھے، جو
اکسفرڈ یونیورسٹی پریس میں چھپ کر ایک رسالہ کی صورت میں شائع ہو چکے ہین، یہ رسالہ جس کا پورا عنوان
حاشیہ میں درج ہے[1] پروفیسر موصوف کے ایک عمدہ اور صاف فوٹوگراف سے بھی مزین ہے، ان خطبوں
کے دینے کے چند ہی ماہ بعد ان کا انتقال ہو گیا، لہذا ایک لحاظ سے ان خطبوں کو انکی آخری وصیت کی حیثیت حاصل ہے

Educational Problems in the Far East and the Near East by C H. Becker 2/- Oxford Press, 1933

چونکہ ان خطبون میں اونھون نے اپنی دیگر تصانیف کی طرح بالغ النظری اور وسعت خیال کا ثبوت دیا ہے، اس لئے بیجانہ ہوگا، اگر ہم یہان ناظرین کی تشویق کیلئے انکے بعض مضامین کا اختصار کیساتھ ذکر کرون۔

پہلا خطبہ عام ملاحظات پر مشتمل ہے، جس میں مشرق و مغرب کے طریقہ ہائے تعلیم اور مقاصد تعلیم کا مقابلہ کیا گیا ہے، دیگر باتون کے علاوہ مصنف علام نے اس نکتہ کو بیان کیا ہے، کہ مختلف قومون اور ملکون کا تاریخی ارتقاء ان کے اخلاقی اور مذہبی خصوصیات اور ان کی عام ذہنیت مختلف ہے، اسلئے ایک ایسا نظام تعلیم جو اپنے طرز اور مقصد میں بالکل یکسان ہو، مختلف الحال اقوام کے لئے غیر مناسب ہے، اس لئے پروفیسر موصوف اس بات کو پسند نہیں کرتے، کہ مشرقی ممالک اغیار کے طریقون اور خیالات کو اپنے آپ پر اس طور پر مسلط کر لین، کہ اپنی اصلیت اور حقیقت کو کھو بیٹھیں، چنانچہ وہ صفحہ ۱۴ پر لکھتے ہیں، "کہ تعلیمی معاملات میں مشرق کے لئے سب سے بڑا خطرہ یہ نہیں کہ وہ ہمارے خیالات کے بارے میں ایک مخالفانہ انداز اختیار کرے، بلکہ خطرہ اس کے برعکس ہے، یورپ اور امریکہ کے موجودہ سیاسی اور اقتصادی تفوق کے باعث اہل مشرق مغربی اقتصادی طریقوں کے ساتھ ساتھ ایسے خیالات و افکار اور اخلاق و عادات اختیار کر رہے ہیں جن کی نشوونما ایک بالکل مختلف سرزمین میں ہوئی ہے، اس کا یہ نتیجہ ہو رہا ہے، کہ خود اہل مشرق کی نظرون میں اپنی تہذیب و تمدن کی قدر و قیمت گر رہی ہے، اس میں مشرق کے دل و دماغ کے لئے بڑا خطرہ ہے، کیونکہ اس سے ان کے قومی مزاج و خصلت مین انحراف پیدا ہو سکتا ہے، اس قسم کا نتیجہ نہایت درجہ افسوسناک ہوگا، کیونکہ اس سے دنیا کی قوت تخلیق کو بحیثیت مجموعی ضعف پہنچے گا، ہم لوگ جن کو مشرق کے ساتھ دلی وابستگی ہے، اور اس کی تہذیب و تمدن کی قدر کرتے ہیں، اس بات پر زور دینا چاہتے ہیں، کہ مشرق کبھی مغرب کی ہمسری نہیں کر سکیگا، جب تک وہ ہماری نقل اتارنا نہین چھوڑے گا، مطلوبہ ہمسری صرف اپنی اصلی شخصیت کو قائم رکھنے سے حاصل ہو سکتی ہے، خواہ اس سے دنیا مین بوقلمونی اور تنوع پیدا ہو، نہ کہ ہمرنگی پیدا کرنے والی نقالی سے، بنی نوع انسان کی تعلیمی جد و جہد کا یہ مقصد نہیں ہونا چاہئے، کہ ایک ہمرنگ اور یکسان تمدن پیدا



کرے، بلکہ ایک ایسی تہذیب پیدا کرے جسمین مختلف تمدنون کی خوبیان جمع ہون، اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہر ملک و قوم کو اپنے نظام تعلیم میں اپنی قوم اور روایتی خصوصیات کو قائم رکھنا چاہئے

دوسرے خطبہ میں انھون نے خاص چین کی تعلیمی مشکلات اور تیسرے (آخری) خطبہ میں دنیائے اسلام خصوصًا ترکی کے تعلیمی مسائل سے بحث کی ہے، مصنف کی رائے میں اس وقت مشرق میں سب سے اہم تعلیمی مسئلہ یہ درپیش ہے، کہ اُسے مغرب کے متعلق کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے، اس بارہ میں خود ان کی رائے یہ ہے، کہ مشرق یورپ کے دباؤ سے ہرگز نئی زندگی حاصل نہیں کر سکتا، اور نہ ہی اس غلط قومیت کے جذبہ سے جو اپنے ماضی کو بنظر حقارت دیکھتا ہے، اور خیال کرتا ہے، کہ تہذیب ایک ایسی شے ہے، جو دیگر اشیائے درآمد کے ساتھ دساور سے حاصل ہو سکتی ہے، ایشیائی ممالک کے سچے دوستون کو چاہئے، کہ وہ اہل مشرق کو مشورہ دین کہ وہ یورپین بننے کی کوشش نہ کرین، بلکہ مشرقی ہی رہیں، اور وہ یورپین تہذیب کو صرف اسی حد تک اختیار کرین، جس حد تک ہم نے یونان اور روم کے تمدن کو اختیار کیا تھا، یعنی صرف اسی حد تک اختیار کرین، جس سے ان کو اپنی حقیقت سے آگاہ ہونے اور اپنی ذات کی سچی معرفت حاصل کرنے مین مدد ملے، اگر مشرق نے کوئی اور راستہ اختیار کیا تو وہ اپنی اصلیت کو کھو کر ہلاک ہو جائیگا" (ص ۴۴)

جہان تک مجھے معلوم ہے، تا حال پروفیسر موصوف کا صرف ایک مقالہ اردو میں منتقل ہوا ہے، جسے ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب نے جامعہ مین شائع کیا تھا، جہان تک میرا اندازہ ہے بعض حلقون میں اس کا استقبال اچھا نہیں ہوا، کیونکہ مصنف نے اسلام کی دنیاوی ترقی میں اقتصادی عناصر پر جو خاص زور دیا ہے، اس سے بعض لوگون نے یہ سمجھا ہے کہ وہ روحانی موثرات کے منکر ہین،

بہرحال موصوف کی ذات جرمنی میں اسلامیات کے مطالعہ کیلئے ازبس مفید تھی، اور انکا وسیع اثر و رسوخ اس فن سے دلچسپی رکھنے والے افراد کیلئے پشتیبان تھا، انکے انتقال سے (فروری ۱۹۳۳ء) ایک ایسا وسیع النظر اور وسیع القلب عالم صفحۂ ہستی سے اٹھ گیا ہے، جسکا بدل ہمیں جرمنی جیسے مردم خیز ملک میں بھی نظر نہیں آتا،

# قصائدِ مطہرؔ

ازجناب صدر یار جنگ بہادر مولنا حبیب الرحمن خانصاحب شروانی

معلوم ہوتا ہے کہ خود ظہور وخفا بھی کسی مخفی قانون کے تابع ہے، حضرت شیخ دہلوی نے تذکرۃ المصنفین میں دیوان مطہرؔ کو کمیاب بلکہ نایاب لکھا ہے، (اورینٹل کالج میگزین۔ مئی ۱۹۳۵ء) یہ آج سے تین سو برس پہلے کا واقعہ ہے، صدیوں تک گوشۂ گمنامی میں آسودہ رہ کر مطہرؔ کا کلام اب ظہور پذیر ہوتا ہے، اور اس وقت کے ساتھ کہ اسی صوبے کے دو شہروں میں بیک وقت اس کے ظہور کا سامان ہوا،

لکھنؤ میں پروفیسر وحید مرزا صاحب نے حکیم آشفتہ صاحب کے نسخے پر تبصرہ کرکے حق تحقیق ادا کیا، اسی زمانہ میں مولوی ابوبکر شیث صاحب ناظم دینیات نے مسلم یونیورسٹی میں ازراہ معارف پروری ان قلمی نسخوں کی فہرست نویسی شروع کی جو ہنوز تشنۂ توجہ تھے، اسی سلسلے میں ایک قصائد فارسی کا نسخہ سامنے آیا جس کے مولف کا نام پردۂ خفا میں تھا، لوح نام سے خالی تھی، اندرونِ کتاب بھی تفتیش کی حاجت تھی، براہِ کرم ناظم صاحب نے مجھ پر اعتماد کرکے نسخہ تحقیقِ مولف کے لئے عنایت کیا، کسی قدر کاوش کے بعد مطہرؔ تخلص ملا (مصرع، مطہر بندہ کمتر کہ میراث پدر دارد) قصیدہ ۵۱ - دو جگہ اور یہ تخلص نظر سے گذرا، ترکیب بند ۱۳،

مطہرؔ در ثنا خوانی چو در افشانست در پایت ‖ کنونت از سرِ اخلاص دست اندر دعا کردہ

قصیدہ نمبر ۴۴،

از زبانِ مطہرؔ مسکیں ‖ شاہ را ایں دعا مبارک باد،

ایک جگہ کاتب نے تخلص صاف مظفر لکھدیا ہے (دیکھو قصیدہ ۴۴) ظاہر ہے کہ یہ قلم کی لغزش ہے،



شوق مزید تفتیش کا متقاضی ہوا، اپنے یہاں کے محدود وسائل سے کام لینا شروع کیا، یہ کاوش جاری تھی کہ ماہ مئی ۱۹۳۵ء کا اورینٹل کالج میگزین پہنچا، اس میں پروفیسر وحید مرزا صاحب کا مضمون مع فاضل مدیر کے ضمیمے کے دیدہ افروز وسبق آموز ہوا، جو کچھ میں مزید مواد جمع کر سکا پیش کرتا ہوں، اس موقع پر مشہور مصرع بدلنا ہوگا، ع نقاش نقشِ اوّل بہتر کشید از من،

**قصائد مطہر کا نسخہ** تقطیع اوسط - ۹×۶ - شعر فی صفحہ ۱۷ - صفحات ۳۲۸ - اشعار کم وبیش ۵۳۷۶، اول وآخر ناقص، خط جلی، خطاطی کی شان لئے ہوئے، دوسرا صفحہ پورا مطلّا و مذہب، باقی پر جدول، طلائی لاجوردی، کاغذ سمرقندی، اول سے ایک صفحہ نہیں، آخر سے معلوم نہیں کس قدر ناقص ہے، ظاہر ہے کہ اس حالت میں سنہ تحریر کس طرح نظر افروز ہوتا، نسخہ کی مجموعی حالت پر نظر کرکے یہ کہنا بالکل نادرست نہ ہوگا کہ یہ نسخہ نویں صدی ہجری کا لکھا ہوا ہے، صحت کے اعتبار سے عام سطح سے بلند ہے، اشعار پورے ہیں، کہیں کہیں بیاض ہے، نسخے پر نظر ثانی اہتمام سے ہوئی ہے جس کی وجہ سے بہت سے اشعار کا اضافہ ہوا ہے، مثلاً قصیدہ ۴۲ کے صرف سات شعر متن میں تھے، حاشیہ پر نظر ثانی میں ۱۷ شعر کا اضافہ ہوا ہے، اضافہ شدہ اشعار کا خط دو قلمہ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بار سے زیادہ نظر ثانی ہوئی ہے، بعض جگہ تصحیح بھی ہے، کلام ردیف وار مرتب ہے، نسخہ محفوظ ہے، کرم خوردہ یا آب رسیدہ نہیں،

اوّل قصائد ہیں، جن کی تعداد ساٹھ[۶۰] ہے، لکھنوی نسخے میں اڑتیس[۳۸] ہیں، پہلا قصیدہ وہی ہے جو لکھنوی نسخے میں اوّل ہے، قصائد کے بعد ترکیب بند ہیں جن کی تعداد اکیس[۲۱] ہے، ترکیب بندوں کے درمیان میں متعدد مسمطات ہیں، غالباً یہ صحاف کی بے احتیاطی سے مخلوط ہوئے ہیں، اکیسویں ترکیب بند کے ختم ہونے سے پہلے ناتمام نسخہ تمام ہوجاتا ہے،

ایک عجیب واقعہ ہے، ایک جگہ سے زیادہ ایسا ہوا ہے کہ دو ورق باہم ملا کر دہرا کر دیئے ہیں، دبازت اس کی شہادت ہے، روشنی میں دیکھنے سے اندر کی تحریر کی جھلک بھی محسوس ہوتی ہے، اس سے سلسلۂ کلام بھی

درہم برہم ہو جاتا ہے، مثلاً قصیدہ ۳۰ کے آخر صفحہ ۳ مس پر یہ شعر ہے،

بر رخ شاہد گلرنگ شرابِ گلگون | می کشیدند ز ساقیِ سمن بر بسرور

ورق الٹنے پر یہ شعر سر صفحہ ہے،

ندامت آرد اگر باوجود حکمت و شرع | زمامِ نفس بدستِ ہلاک بسپاریم

معلوم نہیں کہ یہ ورق کس مصلحت سے چپان کر دیئے گئے،

**حالاتِ مظہر** حالات جس قدر پروفیسر وحید مرزا صاحب اور فاضل مدیر نے دیدہ ریزی کے بعد فراہم کر دیئے ہیں، ان پر اضافہ دشوار ہے، تاہم جو حالات اور معلوم ہو سکے درج ذیل ہیں،

افسوس ہے کہ جہانتک میں دیکھ سکا سراجِ عفیف اور ضیاء برنی دونوں نے اپنی تاریخ میں مظہر کا ذکر نہیں کیا، دو مزید تذکروں میں ذکر ملا، ایک ریاض الشعراء داغستانی میں، دوسرے مجمع الفصحا سپہر میں، دونوں میں مظہر کے تحت حال لکھا ہے، چونکہ کلام مظہر کا انتخاب کیا ہے، اسلئے بے تامل کہہ سکتے ہیں کہ تصحیف ہے خود تذکرہ نگاروں کی، ریاض الشعراء میں ہے،

"مولنا مظہر از ایران آمدہ در گجرات توطن نمود، طبع در نہایت قدرت و روانی داشتہ"

مجمع الفصحا میں دو جگہ ذکر ہے، اوّل

مظہر گجراتی، از سخن گویانِ شیریں زبان و فاضلانِ نیکو بیان ست و اصلش از ایران ست، ہشت ہزار بیت صاحب دیوان است،

دوم۔ مظہر ہندی۔ "قاضی اگرہ ست و مردے آگہ، مداحِ فیروز شہ بود، و مدح عین الملک نیز نمودہ بعضے او را مظہر مذکور خوانند و بعضے جدا دانند علی ای حال بنام اُو می باشد"

انتخابِ کلام میں دونوں جگہ مظہر کا کلام نقل کیا ہے، لہذا مظہر گجراتی و مظہر ہندی دونوں ایک ہیں، میرے یہان کے نسخہ "تذکرۂ مجمع الغرائب" میں فہرست میں مظہر ہے، اصل کتاب میں مظہر۔ میرے



مخدوم سید صمدانی لکھتے ہیں، کہ تذکرۂ ید بیضا میں میر غلام علی آزاد نے مظہر کو کڑہ کا باشندہ لکھا ہے، نیز یہ کہ فیروز شاہ کے یہان قرب حاصل تھا، (ید بیضا میرے سامنے نہیں ہے[1]) تعجب ہو کہ اس حالت میں میر آزاد کا تذکرۂ خزانۂ عامرہ مظہر کے ذکر سے کیوں فیض یاب نہ ہوا، تذکرۂ مذکور کا موضوع فیض یافتہ شعراء کا ذکر ہے، مظہر فیوض سے مالا مال تھا،

حضرت شیخ دہلوی نے اخبار الاخیار میں مظہر کو حضرت چراغ دہلوی کا مرید خاص لکھا ہے، منقبتِ شیخ میں اس کا ایک قصیدہ نقل کیا ہے، نیز ایک مرثیہ شیخ کی وفات پر،

حضرت شیخ نے کلام مظہر کو کمیاب بلکہ نایاب لکھا ہے، ظاہر ہے کہ دیوانِ مظہر پیش نظر نہ ہوگا، دوسری جگہ سے کلام بالانقل کیا ہو، اس وقت جو ۲ نسخے قصائد کے ظہور پذیر ہوئے ہیں لکھنؤ اور مسلم یونیورسٹی میں دونوں قصیدے اور مرثیہ سے خالی ہیں، مسلم یونیورسٹی کے نسخے میں ایک قصیدہ بطور منظوم ... خواجگان چشت ہے، اسمیں مظہر نے حضرت سرور عالم سے لیکر حضرت نظام المشائخ تک شجرہ کی ترتیب کے ساتھ نام لکھے ہیں، اگر مظہر کو حضرت خواجہ نصیر الدین دہلوی سے بیعت تھی تو سلطان المشائخ کے بعد ان کا نام نامی آتا، مگر ایسا نہیں ہے بلکہ دوسرے نام کا اشارہ ہے، ملاحظہ ہو،

نظام دل و دیں کہ اخلاقِ احمد | درو تعبیہ شد چو در شیر شکر

دگر گشتۂ عشق رکن حقیقت | کہ چوں خواجہ منصور در بنا ادفر

بظاہر رکن حقیقت کا اشارہ رکن الدین کی طرف ہے، اب اشکال یہ ہوتا ہے کہ (سیر الاولیا، خزینۃ الاصفیا اور اخبار الاخیار کی شہادت کے بموجب) حضرت سلطان جی یا حضرت چراغ دہلوی کے خلفاء میں کوئی

[1] معارف :- ید بیضا کی وہ عبارت حسب ذیل ہے :-

قاضی مظہر از اہالی شہر کڑہ است، عالم و فاضل و شاعر کامل بود و در سلک مریدان خاص شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی انتظام داشتہ و در خدمت سلطان فیروز شاہ باعلیٰ مراتب قربت و منزلت محترم زیستہ، ناظم تبریزی گوید کہ شاعر شیریں بیان و رنگین بیانی بودہ، مسودہ اشعار او بخط قدیم در گجرات بدست مولنا محمد صوفی مازندرانی بود، وے اوراق در سلک ترتیب و ترمیم کشیدہ منتشر ساخت

۲ ن ۵ ۲

رکن الدین نہیں، بلکہ دوسرے سلسلوں میں بھی، صرف ایک رکن الدین کا ذکر ان کتابوں میں آتا ہے، اور وہ حضرت رکن الدین ملتانی ہیں، وہ سلسلہ سہروردی کے شیخ ہیں نہ کہ چشتیہ کے، پھر ان کا نام یہاں کیوں آیا، اگر مظہر کو ان سے بیعت تھی تو سلسلۂ چشتیہ کے شجرے میں ان کا نام کیوں آیا، ایک احتمال یہ ہوتا ہے کہ ان دونوں شعروں کے درمیان میں کوئی شعر چھوٹ گیا ہو جس میں حضرت چراغ دہلوی کا نام ہو، یہ احتمال یوں قائم نہیں رہتا کہ خواجہ بختیار کاکی کے ذکر کے بعد حضرت گنج شکر کے نام کا شعر کاتب سے چھوٹ گیا تھا، مقابلے میں حاشیہ پر اس کا اضافہ کر دیا گیا، اگر یہاں بھی شعر چھوٹ گیا ہوتا تو مقابلے کے وقت وہ بھی بڑھا دیا جاتا، بہرحال یہ ایک اشکال حالت موجودہ میں ہے جس کو شروانی کی نادانی حل نہ کر سکی،

علاوہ تذکروں کے خود کلام مظہر کے مطالعے سے حسب ذیل حالات معلوم ہوتے ہیں:۔

مظہر کا باپ بھی شاعر تھا، ہندوستان میں تھا اور شاہی خدمت میں، چنانچہ قصیدہ نمبر ۱۵ میں ہے (واضح ہو کہ نمبر اصل کتاب میں خود میں نے قائم کئے ہیں)

مظہر بندۂ کمتر کہ میراث پدر دارد  دریں درگہ دعا گوئی دریں حضرت ثنا خوانی

مظہر کے قبضہ میں شاہی جاگیر تھی جہاں پانی کے اندر ایک بلند ٹیلے پر مکان تعمیر کیا تھا، ؎

ز جود شاہ دہے داشتم برائے معاش  کہ در دعائش نشستم بکنج تنہائی

میان آب یکے خانہ بنا کردم  بہ پشتہ از بلندی چو چرخ مینائی

چو در عمارت آں خانہ و زراعت دیہ  برفت انچہ کہ بُد نقد جنس دنیائی

خاندان اور خدم و حشم کی تعداد کثیر تھی،

ترا خویش و فرزند و خیل و تبار  فزون از ہزار ند گر بشمری (قصیدہ ۵۰)

قصیدہ نمبر ۳۳ میں ایک اور گاؤں کا ذکر ہے معلوم نہیں یہی تھا یا دوسرا ؎

آں قدر مرحمت و تربیت ارزانی داشت  کہ یکے را نتواں کرد بعمرے ماموں



خانۂ و دیہ دگر ز انچہ بباید اسباب  ہمہ فرمود بداں لطف و بشاشت مرتب معمور

خاتمہ میں کہتا ہے، ؎

استمالت کنم ایں دیہ پریشاں شدہ را  باشد آئندہ دہد جبر یہ نقصان وکسور

قصیدہ نمبر ۴۲ میں اپنی جاگیر کا ذکر زیادہ تفصیل سے کیا ہے، مطلع ہے،

حبذا باغ ارم بقعۂ اسلام آباد  کہ براسلام بنا کردن او میموں باد

حسن مطلع ؎

خاصہ بر ذات خداوند ملک عین الملک  کہ بپا راست جہاں از دو نفس انفس داد

آگے چل کر لکھتا ہے،

اندر آں روز کہ من بردر او کردم عزم  ویں حکایت بدل شاہ جہاں دادم یاد

مرحمت کرد مرا داد دریں جا دیہے  واختیارم زپئے قرب ہمیں قریہ نہاد

ہمہ گفتند کہ دیہیست نکو اما خوط  سخت مستاکلہ و جملہ اقارب بیداد

من چو واثق بدم از نصرت و تائید ملک  التفاتے نہ نمودم بدل از اہل عناد

واں مقدم چو ز دیوان قدر فرصت یافت  شکل دیگر شد و صد تعبیہ بنیاد نہاد

وانچہ واصل بدے از دیہ نمی کرد خط  وانچہ میکرد خط آں نیز نیارستے داد

طرفہ تر آنکہ دراں حوض کہ او شستے سر  رہ نمی داد کہ سازند وضو اہل رشاد

چہ گلے داشت دراں حوض کہ می پرورداو  ہمچو والد کہ کند تربیت مرا ولاد

چہ گلے تیرہ و دریافتہ چوں الفاظاں  کہ بصد حیلہ درو راہ نمی کردے باد

ہر یکے شاخ چو یک سلسلۂ از آہن  ہر یکے خار چو یک نشترے از پولاد

غیرتے داشت براں بیشہ ز چشم مردم  کہ جہاں رشک نہ بردہ ز عرقے داماد

پاے ببریدے اگر خار بریدے نجّار  دست بشکستے اگر شاخ شکستے جلاد

آں زمیں بود کہ میکرد چنیں سو پنہاں  سر برآورد بجاے کہ ز کفر و الحاد

مسجدے را کہ برآورد فلاں کرد خراب  داں صنم خانہ کہ بشکست شہ آں کرد آباد

من چو آں خواریِ دیں دیدم و آں عزتِ کفر  طاقتم طاق شد و صبر درآمد بہ نفاد

گفتم آوخ کہ پسندیدہ بہ نزدیکیِ شہر  در دہے ہر دو گروہے کہ برد حکم سواد

ایں چنیں کفر بود غالب و اسلام ضعیف  چوں فلک سنگ نمی بارد ازیں استبداد

خاصہ آں دہ کہ دہد شاہ بدانشمندے  تا کند علم در و درس و عبادت بنیاد

ہمہ شب بودم ازاں غصہ در اندوہ و قلق  بامداداں کہ سحر گشت سپیدی ز سواد

آمدم بر درِ دیوان و در اصحابِ ملک  کردم از فتنۂ آں کافرِ بے دیں فریاد

راستی اہلِ دوادین و امینانِ ملک  چوں نمودند دریں کار رہی را امداد

بستم آں خوط بصد سلسلہ در ہاویۂ  ہمچو حمدونہ کہ بندد بستونے افراد

بستدم انچہ برد بود ز محصولِ خطی  بگرفتم کہ دریں دہ نبود استشہاد

ہم بریں شرطِ ضمانے ستدم پابرجاے  وانگہے کردم ازاں شدت و بندش آزاد

پس بتوفیقِ خداوند و باقبالِ ملک  ہم بہ تنہا کہ نجستم ز کسے استمداد

وانچہ خیل و تبعش بود بروں کردم نیز  تا شود منقطع از قریۂ من بیخِ فساد

کردم آں بیشہ ہمہ صاف ز بالا و نشیب  کردم آں بتکدہ ناچیز ز بیخ و بنیاد

مسجد آراستم و محراب و مسلمانے چند  کردم آباد کہ باشند بہ ذکر و اوراد

ملک الشرق بدولت چو درآمد در شہر  ویں حکایت بتواتر بشنید از آحاد

آفریں گفت بریں خستہ و از راہِ کرم  گنجِ الفاظِ گہربار بہ تحسیں بکشاد



تاجدارانہ یکے عزمِ سواری فرمود  سوے آں دہ بصد کوکبۂ استعداد

سائبانے و سراپردہ برآں حوض کشید  کہ بپوشید بدیباے یمن سبع شداد

بزمے آراستہ کہ در چشمہ فردوس بریں  خوبتر زاں نتواں یافت مقامِ عباد

و ندریں بزم بسے مائدہ کرد افراز  کہ فزوں آمدہ الوانِ نعم از اعداد

عام در داد صلاے بحواشی و خدم  چوں عجم در مہ بہ نوروز و عرب در اعیاد

الغرض چونکہ ازاں نوش و نعم فارغ شد  کاتبے کرد طلب حاذق و دانے استاد

گفت تا بر سرِ آں حوض مقامے سازند  رائق و روح فزا چوں ارمِ ذات عماد

باغ از جانبِ شرقیش نگارند شرف  برگ زارے بجنوبیش نگارند فیاد

تا نشینند دریں جایگہ اصحابِ علوم  بدعاگوئی سلطانِ جہاں خرم و شاد

قصیدۂ بالا سے حالات ذیل معلوم ہوتے ہیں:-

جاگیر اسلام آباد کے سواد میں تھی، مطہر کا شمار علماء میں بھی تھا، صاحب درس تھا، اسکی تائید قصیدہ نمبر ۳۲ کے ایک شعر سے بھی ہوتی ہے، یعنی اپنی حاضری دربار کے دو ذریعے بیان کرتا ہے،

سالہا آرزوت بود کہ در حضرت شاہ

بطفیلِ علما یا شعرا یابی بار

جاگیر کے گانوں میں مدرسہ اور باغ عین الملک کے حکم سے تعمیر ہوا، قصیدہ نمبر ۲۴ میں ایک جگہ ۷۷۰ھ کا ذکر کرتا ہے،

ترا بہفصد و ہفتاد ہجرِ مدتِ عمر

چو عمرِ نوحِ نبی باد ہفصد و پنجاہ

مختلف قصائد میں شعراے ذیل کے نام لئے ہیں،

جمال اصفہانی، بدیع الہمدانی، رضی نیشاپوری، مغربی، عنصری،
سعدی، نزاری، کمال اصفہانی،
فردوسی، انوری، خاقانی، فرید، عسجدی، عمعق، سنائی، ہمام، ظہیر،

سعدی کی شیریں کلامی اور خاقانی کی بلند پروازی مسلم ہے، چنانچہ قصیدہ نمبر ۵۳ میں ہے،

ہم الفاظ خاقانیم در بلندی
ہم آواز سعدی بہ شیریں زبانی

امیر خسرو دہلوی یا حسن دہلوی کا ذکر نظر سے نہیں گذرا، لیکن وقائع نگاری کا انداز کہتا ہے کہ امیر خسرو کا کلام پیش نظر تھا،

ایک قصیدے میں ذیل کی علمی کتابوں کے نام لکھے ہیں:۔

نحو اور معانی، مقالید و فتح،
صرف ولغت، کامل اور ازہری،
اخبار و آثار، ہر دو صحاح (صحیح بخاری و صحیح مسلم)
تفسیر ۔ کشاف ۔ زمخشری،
فقہ ۔ مبسوط
منطق ۔ مطالع،
علم کلام ۔ مواقف و مقاصد،
حکمت ۔ ابہری،
وعظ و نصائح، کتاب سری،
اخلاق و تہذیب، ناصری، ع "زطب وزنا ریخنا واقدی"۔ کیا واقدی کی طب میں بھی کوئی کتاب تھی؟



تقلیل ۔ مجموعۂ برغری،

مقاماتِ ذیل قصائد میں نظر آئے،

دہلی، فیروز آباد، ٹھٹھہ، جاجنگر، اسلام آباد، نگر کوٹ، غازی پور، قصیدہ نمبر ۳۳ دیکھو،

لیک چوں مدتِ حرمانست ہنوزم باقی | بود والاملک الشرق سوے غازیپور
من چو آنجا ز علائق نتوانستم رفت | رفع کردم ز دعا گوئی خود چند سطور

ایک جگہ عبور گنگ کا ذکر ہے، ع "چناں کن کہ چوں عبرہ کردی زگنگ"، گجرات کے کسی مقام کا نام نظر سے نہیں گذرا اس سے بھی مطہر کا گجراتی ہونا مشتبہ ہو جاتا ہے،

**کلام پر تبصرہ** قصائد مطہر کا انکشاف اس پہلو سے بھی قابل قدر ہے کہ تیموری دور سے پہلے کے عہد کا کلام ہے، جو اب کمیاب نایابی کی حد تک ہے، میرے یہاں علاوہ امیر خسرو اور خواجہ حسن دہلوی کے کلام کے عہد مذکور کے حسب ذیل شعرا کے دواوین ہیں،

عاشق دہلوی (تلمیذ امیر خسرو) خواجہ مسعود بک، جمالی، بدر چاچی، (مطبع نولکشوری) علاوہ اس تاریخی قدر و قیمت کے باعتبار خوبی کلام بھی قصائد مطہر فارسی ادب میں بیش بہا اضافہ ہے، مطہر کے کلام میں سیرابی و تازگی ہے، قوتِ مشاہدہ ہے، اور حقیقی شاعری، محض قافیہ پیمائی و الفاظ نوردی نہیں ہے، مطہر کے کلام کی وقعت بہت بڑھ جاتی ہے، جب ہم اس کے پیش رَو بدر چاچی کے قصائد دیکھتے ہیں، انکی استادی مسلم، لیکن کلام میں سوائے اغلاق، اشکال، اور مقررہ اصطلاحوں اور مضامین کے اعادہ کے جدت و جودت جو سرور آفریں اور دلکش ہو بہت ہی کم ہے، مطہر کے یہاں یہ جنس گرانمایہ بکثرت ہے، اور اسکی یہ خصوصیت مسلم ہے، والہ داغستانی نے لکھا ہے،

"طبع در نہایت قدرت و روانی داشتہ"

سپہر نے مجمع الفصحا میں یہ رائے ظاہر کی ہے،

"از سخن گویان شیریں زبان و فاضلان نیکو بیان ست"

حضرت شیخ دہلوی اخبار الاخیار میں فرماتے ہیں:-

"در فضیلت و بلاغت و فصاحت از منفردانِ روزگار بود"

بتخانہ میں ہے،

"جزالت کلامش بمذاقِ سخن سنجی آں سردفترِ سخن شناسان خوش افتاد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

شعرش بے تکلفانہ و سہل ممتنع است"

ان شہادتوں کے مقابلہ میں ملا عبد القادر بدایونی کی یہ رائے کیا وزن رکھتی ہے،

"چوں ملائی بر شاعری غالب است نقد شعرش چندانی در بازار فضل رواج ندارد"[1]

شاید اس رائے میں ملا صاحب کی ملائیت کا شاعری پر غلبہ رہا،

بڑی شہادت خود اس کا کلام ہے، روانیِ کلام، بلندیِ خیال، متانت و شوکتِ کلام میں اس کے قصائد مسلم الثبوت اساتذہ کے کلام سے دوش بدوش ہیں، شیریں بیانی، سحر آفرینی اور خوش بیانی میں بہت سے شہسواروں سے آگے ہے، ہم ذیل میں اس کے کلام کا تین تاجدارانِ قصیدہ کے کلام سے مقابلہ کرتے ہیں، یعنی انوری خاوری، ظہیر فاریابی و سلمان ساوجی، انوری کا کمال روز روشن کی طرح تاباں ہے، ظہیر و سلمان کی بابت یہ دو قول یاد کر لو "دیوان ظہیر فاریابی ، در کعبہ بدزد اگر بیابی ، شعر سلمان دانا ز یمنان ہر جانی باشد، ان کی لون کو پیش نظر رکھ کر مقابلہ کرو،

## انوری خاوری

دوش چوں چشمۂ خورشید سپہرِ دوّار　　　گشت از چشم نہاں در پسِ ایں پردۂ تار

[1] اورنیٹل کالج میگزین مئی سنہ ۱۹۳۵ء،



روے بنمود مہِ سالِ نو از چرخ چنانک　　　پارۂ زریں از روے صحیفۂ زنگار

جرم او گاہ پذیرندہ از انجم آرام　　　سیر او گاہ نمایندہ ز ارکان آثار

گاہے از دوریِ خورشید ہمی شد فربہ　　　گہ ز نزدیکیِ او باز ہمی گشت نزار

پر از و بود سبک روح زہیری کہ فلک　　　معنی اندر ورق روح ہمی کرد نگار

مغز اندر سخنش ہر چہ قضا را مقدور　　　مدغم اندر قلمش ہر چہ قدر را اسرار

بود بر تختۂ او از ہمہ نوعے آیات　　　بود در دفترِ او از ہمہ وزنے اشعار

باز بر طارمِ دیگر صنمِ سیم اندام　　　یکفے بربطِ سعدی بدگر جام عقار

از تبسم لبِ شیرینش ہمی شد خستہ　　　وز اشارت رخِ زیباش ہمی گشت فگار

سخنش از وتد و واسطۂ موسیقی　　　منکش از و نزد زمزمۂ و موسیقار

حضرتے بود پر از طارم او سخت رفیع　　　سقف او را نہ ستون بود نہ دیوار بکار

ملکے ہمچو خرد عادل و بیدار درو　　　نیک مستظہر و زو یافتہ خاک استظہار

گہ تہی کرد ہمی دامنِ ابر از گوہر　　　گاہ پُر کرد ہمی کیسۂ کان از دینار

صحن و دہلیز و سراپردۂ او اوج و حضیض　　　اشہب داد ہم کرد آخر او لیل و نہار

باد را دخل نیفزاد بوجہے ز دخان　　　آب را خرج نیفکند بوجہے زنجار

## مطہر

بامداداں کہ بیفگند ہوا پردۂ قار　　　شاہد صبح بیند و دلبر خی رخسار

آسماں نامۂ اعمالِ زمیں کرد سپید　　　شب تو گوئی کہ گنہ بود سحر استغفار

سادہ شد چوں دلِ مومن زہمہ ظلمت و زنگ　　　روے مشرق کہ سیہ بود چو خالِ کفار

باد مشکین ز سر زلفِ عروسانِ بہشت　　　می رسانید دم نافۂ آہوے تتار

من کہ در خواب خوش از فتح گرفتم فالے — شدم از غایتِ شادیش چو دولت بیدار
منتظر بودہ ام از غیب کہ دیدم ناگہ — گشت طالع صفتے ہمچو مہے زیر غبار
قاصدے نزد من آمد ز سوے شہر دوان — چوں نسیمے کہ وزد صبحدماں از گلزار
نامۂ در کفِ او مہر بعنوان رہی — کاتبِ نامہ امیرے ز امیرانِ کبار
ہر آں نامہ چو بگشادم و خواندم مضموں — دیدم از غالیہ بر گل رقمے کردہ نگار
ریختہ مشک سیہ بر سرِ کافورِ سپید — راست چوں خطِ دلآویز بتاں گردِ عذار
لفظ چوں آبِ حیاتش ز سیاہی بشکل — چوں گہر داشتہ با نورِ سحر در شبِ تار

. . . . . . . . .

شہر آراستہ دیدیم چو فردوسِ بریں — کو بکوے در تہ او موج زناں در بازار
مرغ و ماغ و بط و سرخاب دراں صحن کبود — فوج در فوج رواں گشتہ چو صفہاے سوار
راست چوں لشکرِ ترکان میانِ لبِ رود — ساحلِ آب گرفتہ سپہِ بو تیمار
صحن او روح فزا ساحتِ او جاں پرور — خاکِ او مشک فشاں نکہتِ او عنبر بار

## ظہیر فاریابی،

وزیرِ مشرق و مغرب نصیرِ دولت و دیں — کہ باد رایتِ عالیش تا ابد منصور
نشست در دل و جسم ملوک ہیبتِ او — چنانکہ صولتِ مے در طبیعتِ مخمور
نہ در حدیقۂ فکرش وزید بادِ غلط — نہ بر صحیفۂ عزمش نشستہ گردِ فتور
ز طول و عرض جہاتِ کمال او صدرہ — مہندسانِ فلک معترف شدہ بقصور
زہے دقائقِ لطفت خفی چو جرمِ سُہا — ولیک گشتہ چو خورشید در جہاں مشہور
صریرِ کلکِ تو در کشفِ مشکلاتِ جہاں — چنانکہ نغمۂ داؤد در اداے زبور



بزیرِ دامنِ افلاک خلقتِ آں مجمر — کہ کردہ طیبِ افق را پُر از بخارِ بخور
بگردِ خطۂ اسلام خفظت آں خندق — کہ شیرِ شرزہ نیابد درو مجالِ عبور
سوے حریمِ خلافت ترا ہماں آتش — نمود راہ کہ اول کلیم را سوے طور
تو رمحے علَم کردہ کہ رایتِ صبح — بزیرِ رایتِ او کم شود بوقتِ ظہور
ترا بحبلِ متین است اعتصام چہ باک — اگر گسستہ شود رشتۂ سنین و شہور
چراغِ بختِ تو زاں شمع بر فروختہ اند — کہ آفتاب بہ پروانہ خواہد ازوے نور
نہالِ جاہِ تو زاں حوض یافتہ ست نما — کہ از ترشحِ آں حاملِ آمدہ ست بحور
فراستِ تو چو افگندہ نور در عالم — نماند در تتقِ غیب ہیچ سرِ مستور
ہماے ہمتِ تو کرگسانِ گردوں را — بعجز و ضعف چو تیہو شمردہ بل عصفور

## مطہر

ملک الشرقِ فلک قدر ملک عین الملک — کہ منیر ست بدو دیدۂ اجرام و دہور
آنکہ دارد بسخا شربِ ایامِ بہار — وانکہ دارد بوغا ہیبتِ ہنگامِ نشور
آنکہ از خاکِ درش رشک برد باغِ ارم — وانکہ از فیضِ کفش طیرہ بود موجِ بحور
آنکہ دارد حسبے تازہ تر از سروِ چمن — وانکہ دارد نسبے پاک تر از مارِ طہور
آنکہ از مادرِ ایام نزاد ست چنو — صفدرے تیغ زن نامورے جلد جسور
آنکہ از ہیبتِ شمشیرِ جہاں آشوبش — لرزہ در روم کند قیصر و در چین فغفور
آنکہ از صاعقۂ گرزِ بلا انگیزش — سنگِ میداں چو سپنداں شود و کرّہ درو
آنکہ در چنگلِ شاہینِ شکوہش . . . — جرمِ عنقا بود از عجز و عنا چوں عصفور
آنکہ دارد ز دبیرانِ ازل دولتِ تو — تا ابد بر سرِ اقطاعِ دو عالم منشور

آنکه در فضل و خرد بیش ز ارکانِ دول — همچو فرقانست ز تورات و ز انجیل و ز بور

آن جوان بخت که در عهد جوانمردیِ او — قفل بر زر ننهاد دست بوقتے گنجور

شهسوارے که کفش در شبِ تاریک نهد — نوکِ ناوک چو مژه در پلکِ دیدهٔ مور

سرفرازے که به هنگام وغا پیکانش — آتش از آب برون آرد و آهن ز صخور

گر نسیمِ کرمش در دهنِ مار وزد — زهرِ او شهد شود همچو لعابِ زنبور

کشور از سایهٔ احسانش چنانست امین — که بروی نوزد هیچ گهے بادِ حرور

من باقبالِ تو امروز درین کشور هند — چه در ابداعِ قوافی چه در انشائے بحور

چو کمالم بسپاهان چو جمالم به هری — چون بدیع از همدان چون رضی از نیشاپور

## سلمان ساوجی

سود خسرو همه با مایهٔ اقبالِ تو خسر — زورِ رستم همه با قوتِ بازوے تو زور

اے نهادِ عدوت قافِ تفاوتِ اجرم — وے سوادِ قلمت عینِ سعادت را نور

شکریست بشکرِ تو همه زود شغات — کام یابند ز دورانِ تو همه سال ثغور

باشد از نسبتِ رایت شرفِ شمس و قمر — می رود با دلِ دستت گهرِ کان دیجور

نه چنان راست نهادی تو سپاهانِ عراق — که کس از راهزنان ناله کند چون طنبور

یافت ترجیح بصد مرتبه بر آبِ حیات — خاکِ نعلِ سمِ اسپت که شرابیست طهور

رشحاتِ کفِ دستِ تو اگر بیند ابر — در سرِ ابر نیفتد پس ازیں بادِ غرور

هر که در دهر کشد سر ز تو چون شاخِ رزان — پایمالِ ستمِ عصر شود چون انگور

قطبِ دیں شاهِ فلک مرتبه محمود که اوست — بهمان سیرتِ محمود محامد مذکور

اے که در سایهٔ انصافِ تو ایست چون کبک — خنده بر بازِ زخشن میزند اکنون عصفور



راے پیرت تتقِ سترِ خدا را محرم — دلِ پاکت نظرِ لطفِ خدا را منظور

پایهٔ سلطنت از سایهٔ قدرت عالی — رایتِ مملکت از رایتِ رایت معمور

بوے اخلاقِ تو دمسازِ شمالست و صبا — هیبتِ احسانِ تو انبازِ جنوبست و دبور

بحر را روزِ عطایت نتوان گفت کریم — کوه را پیشِ وقارت نتوان خواند صبور

عهدِ اقبالِ ترا ملک و ملائک داعی — خطِ فرمانِ ترا چرخ و کواکب مامور

نافِ مشک از اثرِ خلقِ تو یابد آهو — نیش و نوش از غضب و لطفِ تو دارد زنبور

## نمونهٔ تشبیب

فصلِ دی ماه است پیش از صبح خوابا باید کشید — مے بجام و سبوها در نقل دان باید کشید

خرگهے چون مهر و ماه از دیبه باید کرد راست — خوابگاهے چون سپهر از پرنیان باید کشید

مجلسِ چون خلد باید ساخت در ساقی و جاں — حور در بازو و کوثر در میاں باید کشید

زاں لبِ شیرین و جامِ تلخ و یاقوتِ رواں — نوش باید کرد و یاقوتِ رواں باید کشید

مطربِ خوش گوے هم زانوے دل باید نشاند — شاهدے چون نوش در آغوشِ جان باید کشید

ارغوان گل اگر نبود بیاد ایساں — بابتِ گلرخ مئے چون ارغواں باید کشید

شب نکوتر آید از قرابه می کردن بجاں — زانکه می گنج است و گنج ز نهاں باید کشید

گنجِ زر داری زیاده رنج کم کن کز جهاں — هر که گنجش هست رنجِ بس گراں باید کشید

هر سبک روحے که دارد دل گراں از روزگار — گر سبک خواهد دلش رطلِ گراں باید کشید

وانکه در پیرانه سر دارد جوانی آرزو — بادهٔ پیرش ز ساقیِ جواں باید کشید

چرخِ ظالم پیشه خونِ عالمے بر خاک ریخت ق — تا که ایں جور و جفایش هر زماں باید کشید

خونِ فرزندانِ زر را کآسماں در دستِ شیر — نوش باید کرد و ایں کیں ز آسماں باید کشید

درچنیں مجلس کہ ما داریم گر آں شہسوار      خود بیاید ہم بصد زاری عناں باید کشید

موی و روے اوست ہندستاں و طاؤس از قیاس      گر تو آں خواہی ضرورت جور آں باید کشید

آں مثل نشنیدہ آں را کہ طاؤس آرزوست      ناگزیرش زحمت ہندوستاں باید کشید

پیش آں غنچہ لب شیریں زباں کز شوق او    ق    دہ زباں بیروں چو سوسن از وہاں باید کشید

گر کشاید گل دہن گل را دہن باید شکست      زر کشد سوسن زباں او را زباں باید کشید

دل اگر بردند خوباں جاں بریم خدمتے      در جناب صاحب صاحبقراں باید کشید

## نمونۂ تغزل

آں دلبری کہ تو بر باغ رواں تو ئی      نور و زروزگار و ربیع زماں توئی

کوثر توئی بہشت توئی بوستاں توئی      دلبر توئی و دوست توئی دلستاں توئی

عشاق را قرار دل و نور جاں توئی      از جاں چہ بہتر است در آفاق آں توئی

دانم کہ میر مجلس شاہ جہاں تو ئی      کز جام لعل تست جہاں مست و جاں خراب

اے دلبری کہ کوے تو فردوس از ہر است      خط تو باغ خلد سخن آب کوثر است

سرو سہی ست قامت تو یا صنوبر است      مہر سماست روی تو یا ماہ انور است

مشک است طیب زلف تو یا عود و عنبر است      شہد ست جام لعل تو یا شیر و شکر است

درج است در پیش تو یا سلک گوہر است      ما معین ست آب دہان تو یا گلاب

آنی کہ بر سمن بہ شب مشک سودۂ      وز ماہ عارضت خط شبگوں نمودۂ

فریاد من اگرچہ کرشمہا شنودۂ      روزے بہ پرسش من مسکیں نبودۂ

در حسن اگر چو صبح علم بر کشودۂ      بارے چو آفتاب یکے بر سرم بتاب

. . . . . . . .      (در اصل یک شعر ندارد)



## ترکیب بند

صبح چوں نمود رخ شادی ز سر باید گرفت      مجلسے نو دیگر و بزمے دگر باید گرفت

ساغرے از حوض کوثر صاف تر باید کشید      دلبرے از حور عین پاکیزہ تر باید گرفت

از لب شیریں شاہد نقل تر باید چشید      وز کف سیمین ساقی جام زر باید گرفت

عرصۂ بزم صبوح از صبحدم تا چاشتگاہ      گر زیادت نیست بارے ایں قدر باید گرفت

بلبلے کز صبح مستاں را بشارت می دہد      ہم بریں شادی دہانش در شکر باید گرفت

ساعد ساقی اگر تیغ کشد چوں آفتاب      ہم چو جام از جام مے مہر اسپر باید گرفت

قطرۂ کز جام مے بر خاک مجلس می چکد      نے بدست آستیں کز دیدہ بر باید گرفت

جرم مستاں را بہشیاری بدر باید شمرد      عیب ہشیاراں ز دلداری ہنر باید گرفت

اندہ دنیا چو پایانے ندارد از قیاس      کارہا کوتاہ و غمہا مختصر باید گرفت

گر گلے بے خار میخواہی و خمرے بے خمار      بادہ بریاد امیر نامور باید گرفت

صفدر آفاق عین الملک کز اقبال شاہ      ہست سنجر رزم و اسکندر ظفر جمشید جاہ

---

ساقیا مے دہ کہ می ذوقے دگر دارد ہمی      بے خبر باشد ز مے آنکو خبر دارد ہمی

زاں مے مشکیں کہ گوئی جام جاں افزائے او      لون و لذت از گل و شہد و شکر دارد ہمی

درچنیں موسم کہ باد صبح و بستان بہار      آستیں پر مشک و دامن پر گہر دارد ہمی

خرم آں مستی کہ مے در دست و ماہے در کنار      مطربے در پیش و باغی در نظر دارد ہمی

مرغ اندر تابہ زن کردست و نانے در تنور      میوہ اندر نقلداں از خشک و تر دارد ہمی

چشم پر دیدار یار و سبزہ و آب رواں
گوش بر نائی و نے و صوت دیگر دارد ہمی

بامداداں چوں برآرد بانگ زنبور از گلو
طائرے کو تاج یاقوتیں بسر دارد ہمی

مے طلب کن از کلہ دارے کہ بر زریں قبا
جعد او مشکیں کمندے تا کمر دارد ہمی

سرو بالا ماہ رخسارے کہ زلف عنبرش
در دبستانے بہر موے ہنر دارد ہمی

آنکہ چشم شوخ او گوئی بدست غمزہا
خنجر خوں ریز شاہ بحر و بر دارد ہمی

پشتوان دین و دولت بادشاہ شرق و غرب
آفتاب مملکت فرماں روائے شرق و غرب

## نمونۂ معارف

مجرد شود از دین و دنیا قلندر
کہ راہ حقیقی ست زیں ہر دو برتر

جہاں چیست دانی بنزدیک مرداں
طلسمات ابلیس پر شور و پر شر

بظاہر عمارت بباطن خرابی
قبائے جہاں را نیابی تو استر

بآبے است زندہ ببادیست قائم
چہ برباد تکیہ چہ بر آب پیکر

زنے بے وفائیست مکارہ گیتی
باندیش تا چند گشتہ است شوہر

چہ سازی تو با او کہ با کس نسازد
طلاقش بانداز و بگذار و بگذر

بقائے جہاں راست آخر فنائے
بس آنگہ چہ کبر و منی اے برادر

. . . . . . . . . . . . . . . .

. . . . . . . . . . . . . . . .

جمالیست پوشیدہ در پردۂ جاں
کہ محجوب از انست ایں دیدہ ابتر

اگر نیست گردی ز خود رخ نماید
کہ چوں شب سر آمد کند مہر سر بر

بس نیستی بنگری ہستی زیر
کہ ظلش گرفتست ہم بحر و ہم بر



بسود از فقر آفتابے ست پنہاں
کہ سرگشتۂ اوست نہ چرخ اخضر

دریں بحر فقر است درہائے معانی
بزن غوطہ برآر از قعر جوہر

ہر آنکس کہ بگزید فقر اختیاری
توانگر را ور ابمعنی توانگر

گذشتند آناں کہ زیں ملک فانی
جہانے بقا شد برایشان مقرر

. . . . . . . . . . . . . . . .

شراب طہور را چہ آشامد آنکس
کہ خوردست مے از لب لعل دلبر

کسے کز دو عالم گدا گرد او را
چہ دیر و چہ گنبد چہ دار و چہ منبر

عجب طائفہ در خرابات عشق است
نہ ملحد نہ ترسا نہ مومن نہ کافر

بسازند دوزخ ز سوز دل ایشاں
در آرند شاں را تجلّا بریں گر

نخواہند حور و نہ خواہند غلماں
نخواہند تخت و نخواہند افسر

یکے داں یکے خواں یکے گو یکے جوے
قلندر قلندر قلندر قلندر

## واقعہ نگاری فکر تعمیر مکان کا نقشہ اور تغزل

در چنیں وقت خوش و ساعت میمون کہ در وست
ہمہ آثار سعادت ہمہ انوار سرور

من کہ دارم نفس از حسرت ناکامی سرد
من کہ دارم جگر از آتش محنت محرور

خاطرے داشتم از بہر مطر سخت خراب
کہ چگونہ کنم ایں کلبۂ احزاں معمور

خشت نایاب و خشب نادر و اجار بعید
کار تعجیل و کفم بے زر و باز و بے زور

چوں برم محنت سقار و جفائے نجار
چوں کشم زحمت رازان و بلائے مزدور

خود گرفتم نبود بابت ارباب صلاح
جا نگاہے کہ کند نسبت رفعت بقصور

کم از انم کہ بودیکد ومقامے محفوظ — کم از انم کہ بود چند جدارے منظور

ہمدریں فکر بدم غرق کہ ناگاہانی — اندر آمد زدر آں فتنۂ ایام دشہور

جام مے خوردہ دخوی کردہ دخواب آلود — سر زلفیش پریشاں بردامن مخرور

دلستانے کہ اگر وصف کنم خوبی او — نہ عجب دارم اگر نعرہ زنند اہل قبور

دیدۂ سرور وماہ چناں بودش روے — دیدۂ لالہ در ومشک چناں داشت شعور

ساق وساعد زسمن سینہ بیساب زسیم — لب و دندانش گہر بد بر وبازوش بلور

سرو بالاش سہی سنبل گیسویش تر — لالۂ روے طرب نرگس بہ چشمش مخمور

شکل وشیوہ زبالا وخرام وخندہ — ہمہ شیریں واز وخاستہ در عالم شور

دو کلہ دوختہ از دیبہ وزربفت براں — استرے ساختہ قاقم بحواشی معمور

جعد وزلفیش معنبر ز مرامیر وزمشک

جیب و دامانش معطر ز ریاحین وبخور

(باقی دارد)

# خیام

خیام کے سوانح تصنیفات اور فلسفہ پر تبصرہ اور فارسی رباعی کی تاریخ اور رباعیات خیام پر مفصل مباحث اور آخر میں خیام کے چھ عربی وفارسی رسالوں کا ضمیمہ اور اس کے قلمی رباعیات کے ایک نسخہ کی نقل شامل ہے، خیام کے مباحث پر بہت ہی مفصل، کمل اور حتی المقدور محققانہ، یہ سب سے پہلی کتاب لکھی گئی ہے،

ضخامت ۴۰۰ صفحات، کتابت وطباعت وکاغذ اعلیٰ، قیمت غیر مجلد للعہ، مجلد للعہ

"منیجر"



# تلخیص وتبصرہ

## چین مین اسلام

چین میں اسلام کی نشر واشاعت سے متعلق ایک چینی مسلمان جناب محمد سلیمان ینگ کوانگ یوصاحب نے ایک سلسلہ مضامین شروع کیا ہے، جسکی پہلی قسط رسالہ اسلامک ریویو (جون ۱۹۳۵ء) میں شائع ہوئی ہے، چونکہ چین میں مسلمانوں کے قدیم کتبخانے برباد ہوگئے ہین، اور فاضل مقالہ نگار کو وہاں کے شاہی کتب خانے سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہ تھی، اسلئے معلومات خاطر خواہ تفصیل کیساتھ فراہم نہ ہوسکے، تاہم تھوڑا بہت مواد جو مہیا ہوسکا، اوسے موصوف نے یکجا کر دیا ہے، ہم اوس کا خلاصہ ذیل میں پیش کرتے ہین،

اسلام چین میں سمندر کی راہ سے جنوب سے، اور خشکی کی راہ سے شمال مغرب سے داخل ہوا، سنہ ہجری (۶۲۸ء) میں پہلا مسلم مبلغ وہاب بن ابی کبشہ چین میں آیا، کینٹن (Canton) تک جہاز سے اور پھر چانگان (Changan) تک جسے اب شیان (Shian) کہتے ہیں، خشکی سے، چینی روایات مین ابن ابی کبشہ کا نام مختلف طریقون سے درج ہے، مثلاً سرتار (Sarta) اور ساکاپا (Sa-Ka-pa) جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ صحابی رسولؐ تھے، چین کے مسلمان احترام اور محبت کی بنا پر اون کو سید وقوص (Syed wakkus) یا وقوص بابا کہتے ہین، اکثر انھیں پہلا بابا بھی کہتے ہین، یہ رسول اکرم صلعم کے ایک فرستادہ کی حیثیت سے خاندان سوئی (Sui) کے پہلے شہنشاہ کائے ہوانگ (Kai Huang) کے دربار میں دعوت اسلام پیش کرنے کی غرض سے آئے، ان کیساتھ ان کے تین شاگرد اور بھی تھے، جو "دوسرا بابا"، "تیسرا بابا"، اور "چوتھا بابا" کے نام سے مشہور ہین،

شہنشاہ نے اعزاز واکرام کے ساتھ کینٹن میں ان کا استقبال کیا، ایک مسجد تعمیر کرنے کی اجازت دی، نیز حدود سلطنت کے اندر ارکان مذہب کی آزادانہ بجاآوری کا حق عطا کیا، اپنے مشن کے تکملہ کے بعد ۶۳۲ء میں وقوص بابا شہنشاہ کے جواب کے ساتھ عرب واپس گئے، لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ آنحضرت صلعم کا وصال اسی سال ہوگیا تھا، یہ معلوم کرنے کے بعد وہ فوراً ہی پھر چین کی طرف روانہ ہوگئے، اور اب کی بار اپنے ساتھ قرآن پاک کی ایک جلد لیتے گئے، علاوہ ازین اس سفر میں چالیس مسلمان بھی ساتھ تھے، خاندان سوئی کو شکست دیکر خاندان تانگ (Yang Dynasty) نے سلطنت پر قبضہ کرلیا تھا، لیکن جدید شہنشاہ کے دربار پر بھی وقوص بابا کا اثر بہت کافی پڑا، کیونکہ نئے خاندان کے پہلے شہنشاہ نے نہ صرف وہ حقوق قائم رکھے، جو شہنشاہ کائے ہوانگ نے عطا کئے تھے، بلکہ سلطنت کے خزانہ سے کینٹن میں ایک مسجد بھی تعمیر کرادی جو کینٹن بلکہ چین کی پہلی مسجد تھی، اس مسجد کا نام ہوئی شین مسجد (Hwai Shen) یعنی مسجد بیادگار نبی کریم صلعم، یہ شہر کی چہار دیواری کے اندر تعمیر کی گئی تھی، اور اوس کا مینار ایک سو ساٹھ فٹ بلند تھا، سنہ ۱۲ ہجری (۶۳۳ء) میں وقوص بابا نے کینٹن میں وفات پائی، اور شہر کے باہر دفن ہوئے، اُن کے مزار کے قریب ایک مسجد بنا دی گئی، اون کے مقبرہ کی زیارت کے لئے چین کے تمام اطراف وجوانب سے لوگ آیا کرتے تھے،

ان مسجدون کے اردگرد عرب تاجرون کی ایک چھوٹی سی نوآبادی قائم ہوگئی، جن کے تعلقات پڑوسیون کے ساتھ نہایت خوشگوار تھے، معلوم ہوتا ہے کہ چند دنون تک ان کی ایک علحدہ جماعت تھی، کیونکہ اس زمانہ کا ایک وقائع نگار لکھتا ہے، کہ شہر کینٹن کے مسلمانون کا قاضی خود انہی کی جماعت کا ایک شخص ہوتا تھا، اور وہ شہنشاہ چین کے حضور میں اپنے معاملات نہ لیجاتے تھے، مسلمانون کی یہ جماعت جو کینٹن میں آباد ہوئی، جلد بڑھ گئی، کچھ تو اس وجہ سے کہ لوگ باہر سے آکر اسمیں شامل ہوتے گئے، اور کچھ اس وجہ سے کہ انھون نے اہل چین سے شادی بیاہ کے تعلقات قائم کرلئے، اور ان کو مسلمان کرنے لگے، انھون



نے ہسپتال اور مدرسے قائم کئے، اور رفاہ عام کی دوسری ضروری عمارتیں مثلاً کاروان سرائے وغیرہ تعمیر کرائیں، کنوئے اور نہرین بھی بنوائیں،

سمندر کے ذریعہ عرب اور چین کے تجارتی تعلقات پہلے سے قائم تھے، زیادہ تر عرب ہی سے ہوکر شام اور بحر روم کے مشرقی بندرگاہوں میں مشرق کا مال پہنچتا تھا، عربون نے اس تجارت کو چین ایران اور خلیج فارس کے درمیان بہت کچھ فروغ دیا، تجارت ہی کے فروغ کی بنا پر شروع کے مسلمانون کو چین میں ایک اہمیت حاصل ہوگئی، اور تجارت ہی کے سلسلہ میں اول اول ان کا ذکر چینی تاریخوں میں آتا ہے،

جو مسلمان اول اول چین میں آکر آباد ہوئے، اُن کی تبلیغی سرگرمیان کینٹن ہی تک محدود نہ تھین تاریخون سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہانگ کاؤ (Hong chow) بھی پہونچے، جو چین کا شہرگلستان اور صوبہ چکیانگ (Chekiang) کا پایہ تخت تھا، اور اسکے بعد ساحلی شہرون نیز اندرون ملک کے متعدد شہرون میں جاکر آباد ہوئے، خاندان تانگ کے پہلے شہنشاہ کے عہد میں انھون نے ایک مسجد بھی تعمیر کی جسکی تکمیل ۹ھ (۶۳۰ء) میں ہوئی.

صوبہ شنسی (Shansi) کا پایہ تخت سیان (Sian) جو چینی نسل کا اصلی گہوارہ تھا، بتدریج چین میں مسلمانون کا مرکز بن گیا، اور اوسکی یہ مرکزیت اسوقت تک قائم ہے، یہ تین طرف قدرتی حصار سے محفوظ ہے، اور اس کے شمال میں چین کی عظیم الشان دیوار ہے، یہان مسلمانون نے مسجدین اور مدرسے تعمیر کئے، یہ مسجدین آج بھی موجود ہیں، اور ابتدائی مسلمانون کے حیرت انگیز کارنامون کی شہادت دیتی ہیں، سب سے پرانی مسجد جو اس صوبہ کی سب سے بڑی مسجد بھی ہے، سنہ ۱۲۲ ہجری (۷۴۲ء) میں تعمیر ہوئی تھی، اوس کا نام بڑی مسجد ہے، یہ خاندان تانگ کے عہد میں حکومت نے بنوائی تھی، اسکی دیوارون پر قدیم عربی اور چینی عبارتین اب تک ملتی ہیں، حال تک یہ مسجد حکومت کے زیر نگرانی تھی، اور اسکی مرمت بھی حکومت ہی کی طرف سے ہوا کرتی تھی،

شروع کے مسلمان تاجر صوبہ شینسی ہی مین جاکر آباد ہوے، اور وہین اونھون نے تبلیغ دین کا آغاز کیا، اس صوبہ کی آبادی آج چوراسی لاکھ پچاس ہزار ہے، جسمین نصف سے زیادہ تعداد مسلمانون کی ہے، مسلمانون کا دوسرا مرکز چوان کاؤ (Chuanchow) جو صوبہ فوکین (Fukien) کا ایک مشہور ضلع تھا، اور جہان آج بھی مسلمان بڑی تعداد مین پائے جاتے ہین، یہ صوبہ چین کے مشرقی ساحل پر واقع ہے، اور اوس کا بیشتر حصہ پہاڑی ہے، زمین زیادہ تر ریتیلی ہے، تانگ اور سنگ خاندانون کے دور مین مسلمان یہان آکر آباد ہوے، ان کا خاص پیشہ زراعت تھا، اور خصوصیت کیساتھ چائے کی کاشت کرتے تھے، چوان کاؤ مین بھی اونھون نے ایک مسجد تعمیر کی، اگرچہ اس مسجد کی تکمیل کی صحیح تاریخ نہین معلوم، تاہم اتنا معلوم ہے کہ ۲۹۵ سنہ ہجری (۹۰۸ء) مین اسکی مرمت حکومت کی طرف سے ہوئی تھی، اس کا نام "طاہر مسجد" ہے، اس کی دیوارون پر قرآن پاک کی سورتین کندہ ہین، لنگ شان (Ling Shan) کی پہاڑی پر ایک قبرستان ہے، جس مین تیسرے اور چوتھے بابا مدفون ہین، دوسرے بابا کا مزار یانگ کاؤ کے ضلع مین ہے، جو صوبہ کیانگ سو (Kiangsu) مین واقع ہے، ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے، کہ ابتدائی مسلمان دین کی نشر و اشاعت کے لئے چین کے مختلف صوبون مین پھیل گئے تھے، چین مین اسلام کی تبلیغ ابتداءً تمامتر ان مسلمان تاجرون نے کی، جو جنوبی بحرون سے آئے تھے، ۱۳۰ سنہ ہجری (۷۴۷ء) مین ان ابتدائی مسلمانون کی تعداد مین ایک خاص سبب سے اہم اضافہ ہوگیا، آٹھوین صدی عیسوی کے وسط مین چین خانہ جنگیون کا نشانہ بنا ہوا تھا، اور تخت سلطنت کے لئے شاہی خاندان کی دو جماعتین ایک دوسرے کو برباد کر دینا چاہتی تھین بالآخر بہت کچھ قتل و خون کے بعد شہنشاہ سو تسنگ (Su Tsung) نے جو خاندان تانگ سے تعلق رکھتا تھا، خلیفہ منصور سے مدد کی درخواست کی، خلیفہ نے دسہزار مسلمان سپاہیون کا ایک دستہ شہنشاہ کی مدد کے لئے روانہ کیا، جس نے باغیون کو شکست دیکر شہنشاہ کو تخت پر بٹھا دیا، اس واقعہ سے شہنشاہ چین اور خلیفہ کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم ہوگئے، شہنشاہ نے اس احسان کے بدلہ مین مسلمان سپاہیون



کو چین مین آباد ہونے، زمینین خریدنے اور چینی عورتون سے شادی کرنے کی اجازت دیدی، اسکے بعد اسلام کے مبلغ سلطنت چین کے شمالی مغربی حصہ یعنی قنصو اور شنسی کے صوبون مین بکثرت جانے لگے، جہان آج بھی چینی مسلمانون کی اکثریت پائی جاتی ہے، چین مین مسلمانون کا شمار سات کرور ہے، اس کا تقریباً تین چوتھائی حصہ انہی دونون صوبون مین آباد ہے،

چینی اور اسلامی سلطنتون کے درمیان جو دوستانہ تعلقات قائم ہوگئے تھے، وہ سیاسی تعلقات کے قائم ہوجانے سے اور زیادہ مستحکم ہوگئے، ہر ایک نے دوسرے کے دربار مین اپنا سفیر بھیجا، چینی تاریخون مین اُن بہتیرے موقعون کا ذکر ہے، جب مسلم سفرا خلیفہ کی طرف سے تحفے لیکر چین مین آئے تھے، ان تعلقات سے نیز تجارت کے فروغ سے جو ان تعلقات کی وجہ سے نیز عمل ہوا مسلمان تاجرون کی تبلیغی سرگرمیون مین بڑی سہولتین پیدا ہوگئین، ان تاجرون کی ایک بڑی تعداد ماوراءالنہر اور عرب سے چین مین آئی تھی، چینی وقائع نگار اس زمانہ کے حالات مین لکھتے ہین، کہ "مغرب سے مسلمانون کا ایک طوفان اُمنڈ آیا، یہ لوگ تین سو میل سے زیادہ فاصلہ اور سو سے زیادہ ملکون سے آئے، اور پیشکش کے طور پر اپنی مقدس کتابین لیتے آئے، جو قبول کرکے قصر شاہی کے اُس ایوان مین رکھ دی گئین، جو مقدس یا مذہبی کتابون کے ترجمہ کے لئے مخصوص تھا، یون اس زمانہ سے ان مختلف ملکون کے مذہبی مسائل سلطنت مین پھیل گئے، اور اُن پر علانیہ عملدرآمد ہونے لگا،"

آٹھوین صدی کے وسط مین مسلمان صوبہ قنصو مین داخل ہوے، جو اوسوقت سلطنت چین مین شامل تھا، یہ نہین کہا جاسکتا کہ اس صوبہ مین اسلام کی اشاعت کس حد تک ہوئی، لیکن اتنا معلوم ہے، کہ دسوین صدی کے وسط کے قریب وہان کے خان ساتوک (Satoc) نے اسلام قبول کرلیا، وہ اور اس کے جانشین تیرھوین صدی کی ابتدا تک حکومت کرتے رہے، یہان تک کہ چنگیز خان نے اُن کی مملکت کا خاتمہ کردیا، اس مملکت کی رعایا مین قوم یوئگر (Uigur) بھی تھی، اور جب ان لوگون نے ۹۰۰ء یا اس کے قریب اسلام قبول کرلیا، تو ان کے جو بھائی بند چین مین آباد تھے، وہ بھی اس

دین میں داخل ہوگئے، لیکن یہ لوگ اب بھی چینی عورتوں سے شادی بیاہ کرتے رہے، البتہ جو بچے پیدا ہوتے تھے، انکی تربیت اسلام کے اصول پر ہوتی تھی، قوم یوگر کو تجارت کا خاص ملکہ تھا، اور وہ تمام وسط ایشیا میں اپنی تاجرانہ دیانت اور راستبازی کے لئے مشہور تھی،

۱۲۵۹ء میں قبلائی خان چین کے تخت پر بیٹھا، اسی کے عہد میں مشہور سیاح مارکوپولو (M-arco Polo) نے چین کی سیاحت کی، وہ لکھتا ہے، کہ میں چین میں جس حصہ میں گیا وہاں کی آبادی میں بت پرست اور محمد کی پرستش کرنے والے دونوں شامل تھے" اوس نے یہ بھی لکھا ہے کہ مسلمان تمام ملک میں پھیلے ہوئے تھے، اوران کی جماعت کثیر التعداد اور خوشحال ہوگئی تھی، ان میں تاجر، کاریگر، سپاہی، اور دوسرے ملکوں سے آکر آباد ہوجانے والے ہرطرح کے لوگ شامل تھے" قبلائی خان نے اپنے عہد حکومت میں عبدالرحمٰن، سید اجل، اور سید احمد کو یکے بعد دیگرے مالیات شاہی کا صدر مقرر کیا تھا، اسکے دوسرے بڑے بڑے عہدے بھی مسلمانوں کو دئے تھے، اور پایہ تخت پکین (Pekin) میں اُن کے لئے ایک شاہی مدرسہ (Imperial College) قائم کیا تھا، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلمانوں کی اہمیت روز بروز بڑھتی جاتی تھی، لیکن مسلمانوں کے ساتھ قبلائی خان کا یہ برتاؤ صرف اسی تک محدود نہ تھا، بلکہ شروع ہی سے چین کے مسلمان خوشحال تھے، اور انھیں حکومت کی اعانت حاصل تھی، اونھیں وہ تمام حقوق ومراعات حاصل تھے جن سے ملک کے دوسرے باشندے مستفید ہوتے تھے، حکومت کا کوئی عہدہ اون کے لئے مسدود نہ تھا، وہ صوبوں کے گورنر بھی ہوتے تھے، فوج کے جنرل بھی ہوتے تھے، مجسٹریٹ اور وزیر بھی ہوتے تھے، اور پھر حکومت اور رعایا دونوں کے نزدیک یکساں طور پر معتمد اور معزز تھے، چینی تاریخوں میں مسلمانوں کا نام نہ صرف مشہور فوجی اور ملکی افسروں کی فہرست میں ملتا ہے، بلکہ مختلف حرفتوں اور علم وفضل کی مختلف شاخوں مثلاً ریاضی وہیئت وغیرہ میں بھی وہ نمایاں نظر آتے ہیں،

"ع ز"



# زہرہ پر زندگی کا امکان

ستارہ زہرہ زمین سے کسی قدر چھوٹا اور وزن میں کم ہے، ۲۲ میل فی سکنڈ کی رفتار سے چل کر آفتاب کے گرد اس کا چکر ۲۲۴ روز میں پورا ہوتا ہے، زمین سے اوس کا فاصلہ دو کرور ساٹھ لاکھ میل سے سولہ کرور میل تک رہتا ہے، لیکن زہرہ کی سطح ہمیشہ گھرے بادلوں سے چھپی رہتی ہے، جو کبھی پھٹتے نہیں، اسی وجہ سے زہرہ کے دن کا طول بھی یقین کے ساتھ معلوم نہیں ہے، بعض ہیئت دانوں کا خیال ہے، کہ عطارد (Mercury) کی طرح زہرہ کا بھی ایک ہی رُخ مستقل طور پر آفتاب کی جانب رہتا ہے، لیکن یہ قرین قیاس نہیں، کیونکہ زہرہ کا تاریک حصہ بھی سرد نہیں ہے، گمان غالب یہ ہے کہ زہرہ کا دن ہمارے تین چار ہفتوں کے برابر ہے،

زہرہ پر آکسیجن اور پانی کے ابخرات معلوم کرنے کی کوششیں بارہا کی گئی ہیں، کیونکہ یہ چیزیں اگر اس کے ہوائی کرہ میں موجود ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ اوسپر زندگی بھی نہ پائی جاتی ہو، لیکن ہر تجربہ کا نتیجہ نفی میں نکلا تاہم اس سے یہ نہیں ثابت ہوتا، کہ زہرہ کا ہوائی کرہ آکسیجن یا پانی کے ابخرات سے بالکل خالی ہے، تجربوں سے بادل کی تہ کے نیچے کا حال کچھ بھی معلوم نہ ہوسکا، ہم صرف اس قدر نتیجہ نکال سکتے ہیں، کہ بادل کی تہ کے اوپر آکسیجن کی مقدار ہماری زمین کے ہوائی کرہ کی مقدار کے ہزارویں حصہ سے بھی کم ہے، جو بادل زہرہ کو چھپائے ہوئے ہیں، وہ ضرور پانی کے منجمد ابخرات کے بادل ہوں گے، اس بنا پر معلوم ہوتا ہے، کہ پانی کے ابخرات کی مقدار بہت وافی ہوگی، زہرہ کے ہوائی کرہ کے متعلق جو بات یقینی طور پر معلوم ہے، وہ یہ ہے کہ اس میں ایک بہت بڑی مقدار کاربن ڈائی آکسائڈ (Carbon dioxide) کی موجود ہے،

زمین کی بہ نسبت زہرہ آفتاب سے قریب تر ہے، اور اسی لئے زیادہ گرم بھی ہے، علاوہ بریں بادلوں کی تہ ایک کمبل کا کام دیتی ہے جس سے حرارت محفوظ رہتی ہے، زہرہ میں غالباً بڑے بڑے سمندر بھی

ان خشکی وجہ سے آب و ہوا گرم اور حد درجہ مرطوب ہوگی، وہاں کی آب و ہوا ہمارے منطقۂ حارہ سے بھی زیادہ گرم ہے، کاربن ڈائی آکسائڈ کی کثرت اور آکسیجن کی قلت سے معلوم ہوتا ہے، کہ غالبًا وہاں نباتات کا وجود نہیں ہے، زمین پر نباتات ہوا سے کاربن ڈائی آکسائڈ جذب کرتے رہتے ہیں، اور اس طرح آکسیجن کی فراہمی پوری کرتے رہتے ہیں، اگر نباتات سے آکسیجن کی مقدار برابر پوری نہ ہوتی رہتی، تو ایک نہ ایک وقت تمام آکسیجن دوسری چیزوں سے مخلوط ہو جاتا، اور ہوا میں آکسیجن کے نہ ہونے سے زندگی قائم نہ رہ سکتی،

یہ بھی ممکن ہے کہ زہرہ کی سطح پر تمام سمندر ہی سمندر ہوں، گہرے بادلوں کی ایک موٹی تہ جو ہمیشہ قائم رہتی ہے، نباتات کا موجود نہ ہونا، آکسیجن کی کمی، اور کاربن ڈائی آکسائڈ کی زیادتی، یہ تمام باتیں اس خیال کی موافق ہیں، بہت ممکن ہے کہ زہرہ کی موجودہ حالت ویسی ہی ہو، جیسی اب سے کروروں سال پہلے زمین کی تھی، جب کہ اس پر کسی قسم کی زندگی نمودار نہ ہوئی تھی، اور جب کہ یہ بمقابلہ اس وقت کے محسوس طور پر زیادہ گرم تھی، مریخ کے حالات ایسے ہیں کہ ویسے حالات کرۂ ارض پر ممکن ہے، آیندہ ایک طویل مدت میں پیدا ہو سکیں، برخلاف اس کے زہرہ فی الحال شاید اس منزل میں ہے، جس سے ہماری زمین مدتوں پہلے گذر چکی ہے،

غالب خیال یہ ہے کہ اسوقت تک زہرہ پر زندگی کے آثار ظاہر نہیں ہوئے ہیں، ہم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں، کہ زندگی کے ابتدائی نشانات ممکن ہے اب نمودار ہو رہے ہوں، جوں جوں نباتات بڑھتے جائینگے آکسیجن کی فراہمی میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا، اور حیات کی بلند تر قسموں کے لئے مناسب حالات بتدریج پیدا ہوتے جائیں گے، یہاں تک کہ اسوقت جب شاید ہماری زمین کے حالات اس حد تک بدل جائیں کہ نوعِ انسانی تنازع للبقا، کی آخری جد و جہد میں دم توڑ رہی ہو، تو نظام شمسی میں زہرہ ہی وہ سیارہ ہے جو زمین کے بجائے ذی شعور ہستیوں کا مسکن ہو جائے گا،

"ع ز" "ذ ۔ ط"



# اخبار علمیہ

## بجلی اور اُس سے تحفظ

حال میں بجلی کی تحقیق دو مختلف حیثیتوں سے کی گئی ہے، اوّل سائنٹفک نقطۂ نظر سے جو زیادہ تر برطانیہ میں کی گئی ہے، دوم صنعت و حرفت کے ایک مسئلہ کی حیثیت سے جس میں زیادہ حصّہ امریکہ نے لیا ہے، جہاں ہزاروں میل لمبے برقی تار آسمانی بجلی کی زد میں رہتے ہیں، اس تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ بجلی کی کڑک سے برق کی ایک بہت بڑی مقدار پیدا ہو کر بادل کے مختلف حصّوں نیز بادل اور زمین کے درمیان برقی خطوں کی شکل میں پھیل جاتی ہے، طبعی طور پر ہوا برق کے لئے غیر موصل (Non Conductor) ہے، لیکن اگر یہ برق کی شدید زد میں آجائے تو اس کے حاجزانہ خواص (Insulating Properties) ساقط ہو جاتے ہیں اور مقامی طور پر یہ ایک اچھی خاصی موصل (Conductor) بنجاتی ہے، بجلی کے تمام شرارے بادل کے اندر پیدا ہوتے ہیں، اور چونکہ ہوا کے حاجزانہ خواص اس وقت ساقط ہو جاتے ہیں اس لئے بجلی برقی خطوں کی طرف دوڑتی ہے، اگر وہ خط زمین کی جانب ہے تو بجلی بھی زمین کی جانب دوڑتی ہے، اب اگر زمین کی طرف آتے وقت بجلی کی لہر کا سرا کسی برقی موصل کے قریب پہنچ جاتا ہے تو یہ موصل اسے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے، جس موصل میں مزاحمت کی طاقت کم ہوتی ہے، وہ بجلی کی ایک بڑی رو کو بھی بغیر کسی نقصان کے زمین کے اندر پہنچا دیتا ہے، تجربہ سے دیکھا گیا ہے کہ تانبے کا تار جسکا قطر ½ انچ ہو بجلی کی نہایت شدید رو کو بھی بچا سکتا ہے، اور قریب کی چیزوں پر بجلی کا کوئی اثر ہونے نہیں پاتا، لیکن اگر موصل

میں مزاحمت کی طاقت زیادہ ہو، مثلاً اگر وہ کوئی درخت ہو، تو وہ بھی بجلی کو اپنی طرف کھینچ لیگا، مگر پوری طرح زمین میں منتقل نہ کر سکے گا، نتیجہ یہ ہوگا کہ بجلی کچھ تو درخت کے تنے کے اندر سے اور کچھ درخت کے باہر سے زمین تک پہنچیگی، بجلی کا جو حصہ درخت کے اندر پہنچ جائیگا وہ مزاحمت کی سختی کی وجہ سے درخت کو چور چور کر دے گا، اور جو حصہ درخت کے باہر سے زمین کے اندر جائیگا وہ ہر اس چیز کے لئے خطرناک ثابت ہوگا جو درخت کے قریب ہوگی،

---

یہ دیکھا گیا ہے کہ برقی موصل جو کسی سطح کے اوپر نصب کیا گیا ہو، بجلی کے ہر اُس خروج کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے جو موصل کی عدم موجودگی میں اس مقام پر موصل کی لمبان کے برابر فاصلہ سے گذرتا، لہذا اگر کوئی طویل موصل کسی عمارت پر کھڑا کر دیا جائے تو وہ بجلی کو اپنی طرف کھینچ لیگا اور عمارت پر گرنے نہ دیگا، بجلی زیادہ تر انہی عمارتوں پر گرتی ہے، جو دوسری عمارتوں سے نمایاں طور پر زیادہ بلند ہوں، مثلاً گرجا یا مینار، معمولی اور نیچے مکانوں پر بجلی کے گرنے کا اندیشہ بہت کم رہتا ہے، جہانتک ذاتی حفاظت کا تعلق ہے، یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص مکان کے اندر ہے تو اس کے لئے خطرہ تقریباً بالکل ہی نہیں ہے، اس کا ثبوت یوں ملتا ہے کہ بجلی سے مرنے والوں میں عورتوں سے بہت زیادہ تعداد مردوں کی ہے، جو بجلی گرتے وقت گھروں سے باہر کام کاج میں مصروف تھے، چنانچہ انگلستان اور ویلز میں سنہ ۱۹۲۱ء سے سنہ ۱۹۲۳ء تک جو لوگ بجلی سے ہلاک ہوئے ان کا سالانہ اوسط سرکاری اعداد و شمار کے مطابق نو مرد اور ایک عورت تھا، حفاظت کے اعتبار سے مکان کا ہر حصہ تقریباً یکساں ہے، یہ صحیح ہے کہ بجلی کبھی کبھی دود کش (چمنی) کی راہ سے مکان میں آجاتی ہے، لیکن وہ اُن تاروں کے ذریعہ سے بھی داخل ہو سکتی ہے، جو مکان کے کسی حصہ میں ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہوں اور لاعلمی کی حالت میں ہم اُن سے قریب ہی ہوں، عام طور پر یہی دیکھا گیا ہے، کہ معمولی مکانوں پر بجلی کے حادثات بہت شاذ ہوتے ہیں، میدانوں میں جہاں درخت اور مکان قریب نہ ہوں بجلی کا خطرہ مکانوں کے اندر سے بھی کم ہے، کیونکہ وہاں کوئی چیز بجلی کو اپنی



طرف کھینچنے والی نہیں ہوتی، گھروں کے باہر حادثات کی زیادتی کا بڑا سبب یہ ہے کہ لوگ درختوں کے نیچے پناہ لیتے ہیں، کچھ شہادتیں اس امر کی موجود ہیں کہ بعض قسم کے درخت دوسری قسم کے درختوں کی بہ نسبت بجلی کو زیادہ کھینچتے ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ فلاں درخت اس لحاظ سے خطرناک اور فلاں محفوظ ہے، درختوں پر بجلی کے اثر کا مسئلہ ابھی پوری طرح حل نہیں ہوا ہے، بجلی چمکنے کی حالت میں سب سے زیادہ خطرناک چیز کسی دھات کا حصار اور خصوصاً تار کا حصار ہے، اگر تار کے کسی حصہ پر بجلی گرے گی تو اسکا اثر تار کی پوری لمبان تک پہنچ جائیگا، اور اگر اس وقت ایک میل کے فاصلہ پر بھی کوئی اس تار کو چھوئے ہوا ہوگا تو موت یقینی ہے،

## ۵۰۰ سنہ قبل مسیح کی مختصر نویسی

مختصر نویسی کی تاریخ کا ذکر اجمالی طور پر ان صفحات میں پہلے بھی آچکا ہے، لیکن اسکی ابتدا کب اور کہاں ہوئی؟ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس پر حال تک ماہرین فن متفق نہ ہو سکے تھے، بعض کہتے تھے کہ اسے مصریوں نے ایجاد کیا، بعض اس کو عبرانیوں کی طرف منسوب کرتے تھے، بعض اسے اہل رومہ کا کارنامہ بتاتے تھے، یہ مسئلہ بھی تحقیق طلب تھا کہ آج دنیا میں مختصر نویسی کے جتنے طریقے رائج ہیں، وہ قدیم مختصر نویسی سے کہاں تک ماخوذ ہیں، چنانچہ ایک طریقہ وہ ہے جو بنجامن فرینکلن (Benjamin Franklin) اٹھارہویں صدی کے مشہور امریکن مدبر اور سائنس دان کے نام سے منسوب ہے، دوسرا طریقہ وہ ہے جسے پیپیز (Pepys) نے اپنے مشہور و معروف روزنامچہ میں استعمال کیا تھا، پیپز کے زمانہ میں (سترہویں صدی عیسوی) مختصر نویسی کے متعدد طریقے رائج تھے، آج کل بھی برنرڈ شا (Bernard Shaw) نے اپنے لئے مختصر نویسی کا ایک خاص طریقہ ایجاد کیا ہے اور اس کا خیال ہے کہ اس سے بہتر کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہے، محققین کی رائے ہے کہ یہ تمام طریقے بظاہر حال کی ایجاد ہیں، کیونکہ وہ قدیم طریقہ جس نے اول اول مختصر نویسی کی بنیاد ڈالی تھی، کچھ دنوں کے بعد منقطع ہو گیا تھا، خود رومن مختصر نویسی کے متعلق ان کی تحقیق یہ ہے کہ

وہ اہل رومہ کی ایجاد نہ تھی بلکہ انھوں نے صرف یونانی ایجاد کو اپنے ہاں رائج کر لیا تھا، لیکن تحقیق کا قدم یونان کی تعیین کے بعد رک گیا تھا، اور حال تک یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ قدیم مختصر نویسی کب ایجاد ہوئی اور اس کی کلید کیا تھی، اب سے نصف صدی قبل مصر میں رومن عہد کے ایک مقبرہ سے نو چوبی تختیاں برآمد ہوئی تھیں جن پر موم جمائی ہوئی تھی اور موم پر عجیب و غریب نشانات بنے ہوئے تھے، برٹش میوزیم کے مبصرین نے تحقیق کی کہ یہ یونانی مختصر نویسی کے علامات تھے، یہ علامات ایک ہی طرز کے تھے اور بار بار لکھے گئے تھے، غالباً کسی طالب علم نے مختصر نویسی کی مشق کی تھی، لیکن مبصرین کی انتہائی کوششوں کے باوجود ان علامات کی تشریح معلوم نہ ہو سکی، اس کے بعد دوسری تحریریں بھی مصری مقبروں سے برآمد ہوئیں مگر ان سے بھی اس قدیم مختصر نویسی کی کلید حاصل نہ ہوئی، البتہ اتنا ضرور ہوا کہ دوسرے ملکوں میں بھی اس مسئلہ سے دلچسپی لی جانے لگی، مثلاً وئینا میں ویزلی ([illegible]) نے چند بنیادی اصول قائم کئے اور پھر کونسبرگ میں منتز ([illegible]) نے ویزلی کے انکشافات میں کسی قدر اضافہ کیا، تاہم جہان تک کلید کا تعلق ہے، یہ معما لاینحل ہی رہا، لیکن اب حال ہی میں مصر کے ایک مقبرہ سے دو جلدیں برآمد ہوئی ہیں جنھوں نے اس گتھی کو بالآخر سلجھا دیا، یہ جلدیں برٹش میوزیم کی طرف سے خرید لی گئیں، اور مبصرین کی ایک جماعت نے ان کے مطالعہ کے بعد دیکھا کہ ان میں بھی قدیم یونانی مختصر نویسی کے ویسی ہی علامات ہیں، جیسے ان چوبی تختیوں پر پائے گئے تھے، لیکن سب سے زیادہ اہم چیز جو معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ ان جلدوں میں علامات کا تشریحی ترجمہ بھی درج تھا، اس طرح یونانی مختصر نویسی کی کلید آخرکار ہاتھ آ ہی گئی، محققین کا خیال ہے کہ اسکی ابتدا سنہ قبل مسیح میں ہوئی تھی، اس کلید نیز ان چوبی تختیوں اور دوسری تحریروں کی مدد سے جو مصر میں پائی گئی تھیں مسٹر ملنز ([illegible]) نے جو برٹش میوزیم میں شعبۂ مخطوطات کے نائب ناظر ہیں یونانی مختصر نویسی کا ایک مکمل نقشہ تیار کر لیا ہے، اور اب یونانی مختصر نویسی کے تمام معمے بآسانی حل ہو جائیں گے۔

"ع ز"



# ادبیات

## نذر عقیدت بہ دربار رسالت

بہ تقریب ۱۲ ربیع الاول

از یحییٰ اعظمی

وہ عالم تجھ پہ صدقے اے زمین گنبد خضرا
تری آغوش میں آسودہ ہے وہ برزخ کبریٰ

وہ جس کی ذات والا، اک نوید رحمت عالم
وہ جس کا روے زیبا شمع ظلمت خانۂ دنیا

وہ جس کا نطق شیریں، نغمۂ الہام ربانی
وہ جس کا خلق نوشیں شہد سے بڑھکر حلاوت ور ذا

وہ جس کی ہستی اقدس سراپا معنی قرآن
وہ جس کا ہر نفس و قصہ پیام ملت بیضا

وہ جس کے در گہ سامی کا جبریل امین چاکر
وہ جس کے عتبۂ عالی پہ قدسی ناصیہ فرسا

وہ جس کے آستان پر رفعت عرش بریں صدقے
وہ جس کے بوستان میں نغمہ پیرا بلبل طوبیٰ

وہ جس کے عالم جاں میں نوای قدس برق افشانی
وہ جسکے ذوق ایماں میں پیام شوق شور افزا

وہ جس کے قدسیان پاک گوہر وید کے طالب
وہ جس کے نوریان عرش اعظم والہ و شیدا

وہ جسکی مدحت خوبی میں ہر رطب اللساں قرآں
وہ جسکی شان محبوبی ہے سبحان الذی اسریٰ

وہ جس کے خم کدہ کے حضرت فاروق صہبائی
وہ جس کے گل کدہ کے حضرت صدیق اک طوبیٰ

وہ سرشار مے باقی تصدق جس پہ سے خانہ
وہ ساقی جسکے دم سے ضو فشاں خمخانہ بطحا

وہ جس کے بادہ نوشوں میں بلال و بوذر و سلمان
وہ جس کے سرخوشوں میں ابن زید سید الشہدا

وہ جسکی موجِ مے میں جلوہ پیرا برقِ سینائی
وہ جس کا تا ابد باقی خمارِ نشۂ صہبا

وہ جس کا نقشِ پا سجدہ گہِ ہر دو مہِ کامل
وہ جس کا داغِ سیما مطلعِ نورِ سحر گویا

وہ جس کی برقِ ایماں بیقرارِ جلوۂ ایمن
وہ جس کا ذوقِ عرفاں زندہ دارِ خلوتِ شبہا

وہ جسکے بوریا پر سطوتِ تختِ شہی قرباں
وہ جس کے فقر سے لرزاں شکوہِ قیصر و کسریٰ

محمد وہ کمالِ آخرینِ محفلِ عالم
محمد وہ جمالِ اولینِ شاہدِ معنیٰ

محمد وہ نسیمِ نو بہارِ گلشنِ ہستی
محمد وہ شمیمِ مشکبارِ جنت الماویٰ

محمد وہ شبستانِ ازل کی شمعِ نورانی
محمد وہ ز سر تا پا جمالِ جلوۂ سینا

محمد وہ درِ تاجِ رسل وہ خاتمِ مرسل
محمد وہ ظہورِ نورِ کل وہ جلوۂ یکتا

محمد وہ گروہِ اولیا کے سید والا
محمد وہ کلاہِ انبیا کے طرۂ زیبا

محمد وہ نبوت کے شرف کے مبدء و خاتم
محمد وہ رسالت کی صدف کے لولوئے لالا

محمد وہ شہنشاہِ دو عالم سرورِ افخم
محمد وہ مہِ دو ہفتۂ یثرب شہِ بطحا

محمد وہ نویدِ لطفِ عام و رحمتِ عالم
محمد وہ پیامِ نو بہارِ گلشنِ دنیا

محمد وہ سحابِ رشحہ بارِ مزرعِ گیتی
محمد وہ شبابِ روزگارِ ملتِ بیضا

محمد وہ بہارِ تازۂ باغِ براہیمی
محمد وہ چمن پیرائے باغِ ملتِ آبا

وہ خورشیدِ ضیا بارِ عرب جس کی تجلی سے
عرب کا ذرہ ذرہ آسمانِ قدس کا تارا

وہ رشکِ مہرِ عالمتاب جس کی جلوہ ریزی سے
شبستانِ جہاں میں پھر ہوا نورِ سحر پیدا

ہوا پھر مطلعِ انوار ظلمت خانۂ عالم
سرِ فاراں جو مہرِ ضوفشانِ مصطفیٰ چمکا

سیاہی ہو گئی کافور یکسر شامِ ظلمت کی
صبا لائی پیامِ نور پھر صبحِ سعادت کا

نئے انداز بیداری سے کروٹ لی زمانے نے
خمارِ خوابِ نوشیں سے یکایک جاگ اٹھی دنیا



جہاں کے گلشنِ پژمردہ میں تازہ بہار آئی
رگِ افسردۂ ہستی میں خونِ زندگی دوڑا

دلِ بے نور میں رخشاں ہوئی پھر شمعِ ایمانی
یہ خاکستر ہوئی پھر سوزِ ایماں سے شرر افزا

نگاہِ معرفت پیدا ہوئی پھر دیدۂ دل میں
عطا ظاہر کو، باطن کو ہوئے پھر دیدۂ بینا

عرب کی وادیاں تکبیر کے نعروں سے گونج اٹھیں
ہوا عالم میں آوازہ بلند اللہ اکبر کا

زبانِ کفر وقفِ کلمۂ حق ہو گئی یکسر
زمیں سے آسماں تک غلغلہ توحید کا اٹھا

فضائے کفر و باطل ہو گئی پر شور شیون سے
نوائے اہلِ دل سے ہو گئی معمور پھر دنیا

جھکا دیں گردنیں اربابِ طغیان و تمرد نے
ہوئے نام آورانِ کفر اک اک بندۂ مولا

ہر اک کافر بڑھا لبیک کہکر دعوتِ حق پر
ہر اک منکر نے مضبوطی سے پیمانِ وفا باندھا

فدایانِ محمد بن گئے جو دشمنِ جاں تھے
تو تیغِ محبت ہو گئی یکسر صفِ اعداء

کہیں لطف و محبت تھی کہیں تہدید و شدت تھی
کہیں شانِ جمالی تھی، کہیں قہرِ جلالی تھا

جہاں کے گوشہ گوشہ میں صدائے دینِ حق پہنچی
لوائے حق پرستی مشرق و مغرب میں لہرایا

دیا علم و عمل سے درسِ آئینِ جہانبانی
پڑھایا پھر سبق دنیا کو تدبیر و سیاست کا

شتربانی بھی کرتے تھے جہانبانی بھی ہوتی تھی
ابھی وہ بینوا تھے اور ابھی تھے وہ جہاں آرا

ہوا سکہ رواں عدل و مساوات و اخوت کا
ہوئی پھر از سرِ نو مجلسِ صدق و صفا برپا

فضائل سے ہوئی آراستہ پھر بزمِ انسانی
محاسن کا بنی گہوارہ پھر یہ فسق کی دنیا

دلوں کی خشک کھیتی لہلہائی جوشِ باراں سے
سرابستانِ جاں میں چشمہ پھوٹا نورِ عرفاں کا

شرف بخشا گیا انسانیت کو پھر سعادت کا
بلند اس دور میں پایہ ہوا پھر آدمیت کا

مٹی ظلمت سرائے دہر سے لعنت غلامی کی
زمانہ سے اٹھی رسمِ تمیزِ بندہ و آقا

جسے دیکھو وہ اب سرشارِ صہبائے اخوت ہے
جسے دیکھو وہ اب ہے بادۂ وحدت کا متوالا

ہوا ختم آہ وہ دورِ شرابِ مجلسِ دوشیں — نہ وہ ساقی ہے اب باقی نہ وہ خمخانہ بطحا

کہاں وہ عہدِ سرشاری کہاں یہ دورِ محرومی — کہاں کیفِ مئے عرفاں کہاں رنجِ خمار افزا

وہی مینا ہے اب بھی پر نہیں وہ بادۂ رنگین — وہی صہبا ہے اب بھی پر نہیں وہ شورشِ صہبا

کرے گردورِ گردوں لاکھ اپنی سعی امکانی — پلٹ کر پھر کبھی وہ عہدِ اقدس آنہیں سکتا

نہ دیکھی ہوگی چشمِ آسماں نے بزمِ قدس ایسی — سُنے ہوں گے نہ عالم نے یہ نغماتِ طرب افزا

نہ پائے گا زمانہ پھر کبھی مجد و شرف ایسا — نہ دیکھے گا کبھی پھر یہ سعادت دیدۂ دنیا

مظاہر تھے یہ سارے رحمتُ للعالمینی کے،

کرشمے تھے یہ سب بس آپ کی لطف آفرینی کے

## شہنشاہ کونین کے دربار میں

از مولوی منظور حسین صاحب ماہر القادری حیدر آباد دکن،

اے کہ ترے کرم سے ہیں پست و بلند مستفید — اے کہ ترا وجود ہے وجہ ظہورِ کائنات،

کھولدئیے اک آن میں تونے حقیقتوں کے راز — ایک نظر میں توڑ دی تو نے حدِ تعینات

گردشِ چرخِ چنبری اسکا نہ کچھ بھی کرسکی — تونے نگاہِ لطف سے بخشدیا جسے ثبات

اے کہ ترے ظہور نے دہر سے محو کردیے — کفر کے سب تکلفات شرک کے سب توہمات

صلِ علیک یا نبی، روزِ ازل دیا گیا — تیرے اصول کو خلود تیری حدیث کو ثبات

دہر کو جگمگا دیا طور کو گرد کر دیا، — قلۂ بوقبیس پر اُف رے تری تجلیات

عزم کا تیرے پرتوا، شانِ جلالِ حیدری — صبر کا تیرے آئینہ غربتِ تشنۂ فرات

تیرے جلال کے حضور سطوتِ روم سجدہ ریز — تیرے قدم پہ جبہ سا شانِ شکوہِ سومنات

کب سے کرم کا منتظر ماہرِ نامراد ہے — اس کی طرف بھی یا نبی گوشۂ چشمِ التفات



# مطبوعات جدیدہ

**بلاغ مبین**، از مولوی محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی، ۱۵۵ صفحے، لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ، قیمت ۱۲؍ پتہ دفتر بلاغ مبین، سوئیوالان، دہلی،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف سلاطین حکام، اور قبائل کے سرداروں کے نام جو تبلیغی خطوط ارسال فرمائے تھے، انھیں اس کتاب میں جمع کیا گیا ہے، کتاب تین حصوں "اصول تبلیغ" "فرامین سید المرسلین" اور "نتائج و عبر" کے عنوانوں میں تقسیم ہے، پہلے حصہ میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کے اصول اور طریقے بیان کئے گئے ہیں دوسرے میں مکاتیب و فرامین نبوی ایک ایک کرکے درج ہیں، اور ان میں سے ہر ایک سے متعلق جملہ مباحث و معلومات یکجا کئے گئے ہیں، اور مختلف مقامات پر مختلف فیہ روایتوں پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے، عربی ماخذوں میں مکاتیب و فرامین نبویہ کے متعلق جو معلومات و مباحث ہیں، لائق مصنف نے ان پر غور و فکر کی نظر ڈالی ہے، اور مختلف شبہات کا ازالہ کیا ہے، ایک دو دو عوتی مکاتیب کے فوٹو بھی دے گئے ہیں، جن میں مقوقس شاہ مصر کے نام کا ایک مکتوب ہے، لیکن لائق مصنف نے متن کتاب میں مقوقس کے نام کے خطوں کی دو اصلوں میں سے ایک کو جعلی قرار دیا ہے، اس طرح جس مکتوب کا فوٹو چھاپا گیا ہے، وہ مکتوب کی تیسری اصل قرار پاتا ہے، اور متن کے بیان کے لحاظ سے اُسے بھی جعلی قرار دینا پڑے گا، متن ہی میں اس التباس کو دور کرنا تھا، کتاب کے آخری حصہ "نتائج و عبر" میں عہدِ نبوی میں اسلام کی اشاعت کے طریقے، اور اسلام کی اشاعت کے اسباب و وسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور اس کے بعض اعتراضوں کا رد کیا ہے،

**حقیقت جاپان**، (حصہ اول و دوم) از جناب شیخ محمد بدر الاسلام صاحب فضلی بی اے حجم ۱۶۶

۔۔۔ صفحے، قیمت درج نہیں، ناشر انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، دکن،

جاپان اور ہندوستان کے درمیان گہرے تجارتی تعلقات موجود ہونے کے باوجود ہندوستان کے عام لوگ بڑی حد تک جاپان کے حالات سے بے خبر ہیں، حقیقت جاپان کے لائق مصنف شکریہ کے مستحق ہیں، کہ انھوں نے جاپان کے متعلق معلومات کا قیمتی ذخیرہ اردو میں فراہم کر دیا، موصوف حکومتِ ہند کی طرف سے جاپان کے مدرسۃ الالسنہ خارجہ میں اردو فارسی کے لکچرار بنا کر بھیجے گئے تھے، اور اس سلسلہ میں انھیں وہاں مستقل سکونت اختیار کر کے اس کتاب کے مرتب کرنے کا موقع ملا، اس کا پہلا حصہ "سیاحتِ جاپان"، اور دوسرا جاپان کی معاشرت و تمدن" کے عنوان سے ہے، لائق مؤلف کو اس کتاب کے لکھنے کا خیال آغاز سفر سے ہوا، اسلئے وہ اپنا روزنامچہ قیمتی معلومات کیساتھ دلچسپ انداز میں مرتب کرتے گئے، جس میں جاپان کی خانگی اور پبلک زندگیوں کے دلچسپ واقعات، تاریخی مقامات وعمارات کے مستند حالات، اور ہر قسم کے تمدنی، معاشرتی، اخلاقی، علمی، تعلیمی، اور سیاسی حالات و کوائف درج ہیں، اور دوسرے حصہ میں جاپان کے جغرافی حالات، قومی و نسلی خصوصیات، عقائد و مذاہب، حکومت و سیاست، ادبیات، زبان، تعلیم اور صنعت و حرفت و تجارت" وغیرہ پر مفید و پر معلومات مضامین ہیں، پھر ایک تتمہ میں سیاحوں کیلئے ضروری ہدایات ہیں، اور اس ضمن میں جاپانی زبان کی گویا ایک مختصر ریڈر اردو میں لکھ دی گئی ہے،

کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے، کہ معلومات تحقیق و جامعیت سے مرتب کئے گئے ہیں، اور اس سے جاپان کی مختصر تاریخ کیساتھ عام تمدنی معاشرتی حالات، رسم و رواج اور رہتے سہتے چلتے پھرتے جاپانیوں کی تصویر کھینچ گئی ہے، امید ہے کہ یہ کتاب دلچپی سے پڑھی جائے گی،

**اردو اور صوفیۂ کرام** از مولوی عبدالحق صاحب بی اے، معتمد انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، دکن، ۰۰ ۵ صفحے، قیمت ۸؍

ہندوستانی زبان (اردو) کی تخلیق میں ہمارے صوفیۂ کرام کا بڑا حصہ ہے، وہ عوام کی رشد و ہدایت کے لئے ان سے ان کی زبان سے ملی جلی ہوئی زبان میں باتیں کرتے، اور کبھی ان کی زبان سے معنی خیز جملے ہندوستانی زبان میں نکلتے، جو ان کے ملفوظات اور تذکروں میں قلمبند ہو گئے ہیں، مولوی عبدالحق صاحب نے صوفیہ کے چند ایسے ہی فقروں، دوہوں اور منتروں کو اس رسالہ میں جمع کیا ہے، اور جن موقعوں پر وہ بولے گئے ان کی تشریح کی ہے، اس میں حضرت بابا فرید الدین گنج شکر سے لیکر بابا شاہ حسینی گجراتی تک کے تقریباً ۲۰ صوفیوں کے فقرے یکجا ہوئے ہیں، یہ رسالہ اردو زبان کی تاریخ کی ایک دلچسپ کڑی ہے،



**داستان رانی کیتکی**، ناشر انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد دکن، حجم ۱۵ صفحے، قیمت ۴؍

یہ سید انشاء اللہ خان انشاء کی ٹھیٹھ ہندوستانی زبان میں لکھی ہوئی ایک کہانی ہے، جس میں انھوں نے التزام کیا تھا، کہ عربی فارسی کا کوئی ایک لفظ نہ آنے پائے، اگرچہ اسکی زبان کسی جگہ بیحد نامانوس معلوم ہوتی ہے، مگر اکثر جگہ سادہ طرز تحریر اور محاوروں اور ہندی کے میٹھے لفظوں کا لطف آتا ہے، تعجب ہے کہ اس کہانی کا نام "داستان رانی کیتکی" کیسے قرار پایا!

**میری ناتمام محبت اور دوسرے رومان، لاش اور دوسرے ہیبتناک افسانے،** مصنفہ جناب حجاب اسمٰعیل صاحبہ، حجم ۱۷۱، ۲۱۱ صفحے، قیمت مجلد ۱۲؍، ۱۲؍، ناشر دار الاشاعت پنجاب، ریلوے روڈ، لاہور،

یہ دونوں جناب مس حجاب اسمٰعیل (حال مسز سید امتیاز علی تاج) کے چند افسانوں کے مجموعے ہیں، پہلے مجموعہ میں چار افسانے ہیں، کسی میں ناکام محبت کی تصویر کھینچی ہے، اور کسی میں عشق و محبت کے جذبات کی ترجمانی ہے، اور بعض المیہ افسانے ہیں،

دوسرے مجموعہ میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، ہیبتناک افسانے ہیں، جنمیں انسانوں پر روحوں کے تسلط و متصرف ہونیکے واقعات بیان کئے گئے ہیں،

افسانوں کی زبان اگرچہ صاف ہے، مگر کہیں کہیں ترجمہ کی جھلک نظر آتی ہے، افسانوں کے پلاٹ وغیرہ

بھی مغربی طرز کے ہیں، اور اسی رنگ کی شوخی اور بے حجابی بھی ہے،

**سوانح برادران باربروسہ،** از جناب رحمت نبی خان صاحب رامپوری ۱۰۲ صفحے قیمت ۸؍

جناب صولت حسین خان ایم اے، قاضی ٹولہ بریلی،

اس رسالہ میں سولھویں صدی کے مشہور مجاہد خیرالدین (باربروسہ) کے سوانح حیات اور جنگی کارنامے بیان کئے گئے ہیں، واقعہ نگاری میں جذبات و عواطف کی ترجمانی زیادہ شامل ہوگئی ہے،

**سبل السلام،** از مولوی خواجہ محمد عبدالحئی صاحب فاروقی استاذ تفسیر جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی، ۹۶ صفحے، قیمت ۱۲؍

مولوی خواجہ محمد عبدالحئی صاحب فاروقی جدید مذاق پر قرآن مجید کی مختلف سورتوں کی تفسیریں وقتاً فوقتاً شائع کرتے ہیں، اس سلسلہ کی یہ بھی ایک کڑی ہے، اس میں اٹھائیسویں پارے کی سورتوں کی تفسیر درج ہے، فہرست مضامین کی بعض جلی سرخیاں یہ ہیں "مجلس شوری" "قیام سلطنت" "ترک موالات" "علمائے ملت" "ارباب دولت" "دین و سیاست" اور "نصب العین کی حفاظت" وغیرہ،

**گاندھی نامہ** (حصہ اول) از جناب میاں محمد رفیق صاحب خاور، ایم اے، باغبان پورہ، لاہور، ۹۲ صفحے قیمت ۸؍

یہ گاندھی جی کی منظوم سوانح عمری ہے جسے "ایک مسلم شاعر" نے ایک مسلم شاعر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک "آزاد خیال شاعر" کی حیثیت سے لکھا ہے اور یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ شاعر نہ صرف معانی میں آزاد ہے، بلکہ "زبان و بیان کے مصنوعی اصولوں کی پابندی کو تنگ نظری و ناشناسی پر محمول کرتا ہے، واقعات گہرے وارفتگانہ انداز اور والہانہ جذبات کے ساتھ لکھے گئے ہیں، اور یہ پہلا حصہ گاندھی جی کے سفر ولایت تک کے حالات پر مشتمل ہے،

**مسلمانان موریشش** مرتبہ حکیم عبداللہ سید نواب نبی خانہ مولوی اکبر اردو محلہ حیدرآباد دکن حجم ۴۴ صفحے،

اس رسالہ میں مسلمانان جزیرہ موریشش کے تعلیمی معاشرتی صنعتی اور سیاسی حالات بیان کئے گئے ہیں، رسالہ پر معلومات ہے،

"س"

| جلد ۳۶ | ماہ ربیع الثانی ۱۳۵۴ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۳۵ء | عدد ۲ |
| --- | --- | --- |

## مضامین